ماہنامہ

ترجمان القرآن

بجاری کردہ:

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ، اچھرہ، لاہور (پاکستان)



ماہنامہ ترجمان القرآن

جاری کردہ:

مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ، اچھرہ، لاہور (پاکستان)

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

رجسٹرڈ نمبر ایل : ۵۳۴۰

جلد ۱۱۵ مارچ ۱۹۹۱ء ـــ شعبان ۱۴۱۱ھ عدد ۱

فہرست مضامین

رابطہ و ترسیلِ زر کے لیے : ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ ـ رحمٰن مارکیٹ ، اردو بازار ، لاہور

فون نمبر : ۶۸۶۳۶ - ۳۲۴۴۶۸ پوسٹ بکس نمبر : ۱۴۴۳

فی پرچہ ۶ روپے زرِ سالانہ : ۶۰ روپے

سید حسین فاروق مودودی نے ایگ فاروق ایسوسی ایٹس لمیٹڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

ابھی معراج شریف کی تقریب گذری، شب برات آرہی ہے، اور رمضان المبارک کے ماہ صبر کا چاند ہم پر چمکنے والا ہے۔

صوم اور صبر اور حکمت کی جتنی ضرورت آج ہم کو ہے، اتنی کبھی نہ تھی۔ صبر و حکمت کے بغیر حکمت و تدبر کی راہ آدمی پر نہیں کھلتی ہے۔ خواہشوں اور جذبوں کو آدمی لگام دے کر قابو میں نہ رکھ سکتا ہو یا زبان بتیس دانتوں سے باہر نکلی چلی جا رہی ہو تو نہ ایمان بیدار ہو سکتا ہے، نہ حکمت و تدبر کی راہیں کھلتی ہیں، نہ انسان اپنے آپ کو حیوانوں کی سطح سے بلند تر مقام کا صاحب سمجھ سکتا ہے۔ انفرادی زندگی، نجی اور خاندانی، قومی اور ملکی یا ملی اور بین الانسانی مسائل و مصائب کو سمجھنا اور ان پر صحیح ردعمل دکھانا اور ان کو معقولیت اور اعتدال و توازن سے سمجھنا اور سمجھانا اور ان کے درست حل نکالنا یا ان کے متعلق اپنے ذہنی یا عملی رویے کو صحیح رخ پر رکھنا صرف ان لوگوں کے مقدر میں ہوتا ہے جو خدا کے احکام، رسولِ پاک کے اسوہ اور دین کے تعلیم کردہ نسخہ صبر و حکمت کو برت کر شرفِ انسانیت کے قابلِ احترام مقام تک پہنچیں۔

اس مقصد کو اسلام کے عقائد کے تحت اس کی پنجگانہ عبادات سبھی پورا کرتی ہیں، مگر اس معاملے میں روزہ خاص امتیاز اور فوقیت رکھتا ہے۔

ان مبارک مہینوں میں جن کا سلسلہ حج تک چلے گا، خلیجی جنگ کے سارے مظلومین کے لیے عاجزی سے دعائیں کرنی چاہئیں، کویت کے شہدا اور تباہ شدگان

کے بعد اب جو قیامت عراق کے شہریوں اور عورتوں اور بچوں پر ٹوٹ پڑی ہے۔ اس نے قلوب کو جھنجھوڑ دیا ہے۔ ان سطور کی تحریر کے دوران ہی یہ اچھی اطلاع ملی ہے کہ صدام حسین نے کویت کو خالی کرنے کا اعلان کر دیا ہے۔ یہ اعلان سلامتی کونسل کی قرارداد نمبر ۶۶۰ کے تحت کیا گیا ہے، جس میں لکھا گیا ہے کہ عراق کویت کو غیر مشروط طور پر خالی کر دے۔ ویسے صدام حسین صاحب نے سیاسی مہارت سے کام لیتے ہوئے فلسطین کے مقبوضہ علاقوں کی واگزاری اور اسرائیلیوں کو حال ہی میں دیئے ہوئے مہلک اسلحہ کی واپسی کی شرائط بھی اُٹھا دی ہیں۔

اب اس بابرکت دور میں ہماری دُعا ہے کہ قتل وغارت کا سلسلہ بند ہو، کویت جس نے ۷ ہزار افراد کی قربانی اور دولت اور تیل کی بے شمار تباہی برداشت کی ہے، آزاد مملکت کی حیثیت سے بحال ہو۔ عراق میں انسانی جان و مال کا زیاں ختم ہو، اُمت کی امن کانفرنس کامیابی سے منعقد ہو کر نتیجہ خیز ہو۔ سعودی عرب کو امن واپس ملے اور امریکی اور اتحادی فوجیں رخصت ہوں اور اپنے نیو آرڈر کے شرپسندانہ سامراجی منصوبوں کو فائیلوں میں واپس رکھ دیں۔

اب کہ خلیجی قضیئے کے حل کی راہ نکل رہی ہے۔ اور صدام حسین نے بڑی عظمت کا ثبوت دیتے ہوئے کویت کو خالی کر دینے کا اعلان کر دیا ہے، نیز ہم محسوس کرتے ہیں کہ اب خلیجی ممالک پر وارد شدہ مصیبت ٹل جانے والی ہے، اب ہم ذرا "بازبہ خویشتن نگر" کے احتسابی فارمولے پر عمل کرتے ہیں۔ تاکہ آگے جو آزمائشیں آنے والی ہیں اور پاکستان کے لیے حالات جو ٹیڑھی شکلیں اختیار کر رہے ہیں، ان میں اپنا فرض حکمت و تدبر اور سنجیدگی اور قربانی سے ادا کرنے کے قابل ہو جائیں

پہلا بڑا حادثہ یہ ہے کہ ہم نے بہ حیثیت ملت اپنے آپ کو ایک صاحبِ حکمت و تدبیر قوت کے بجائے، بھڑکتے جذبات کی سرمستی میں غوغا آرائی کرتے ہوئے پیش کیا ہے۔ یہ ایک مقدس دینِ حق رکھنے والی اور ایک شاندار تاریخ کی وارث قوم اوّل تو پچھلے سو پچاس برس سے ماضی کے احوال کی روشنی میں مستقبل کے امکانات کو سمجھ ہی نہیں سکی، اور نہ ہی اس کے دینی رہنماؤں نے، نہ علمی طور پر ریسرچ کرنے والوں نے، نہ سیاسی اکابر اور صحافی و دانش ور اصحاب نے اسے آنے والے چیلنج سے کبھی آگاہ کیا، نہ اس کے مقابلے کی کوئی فکری اور عملی تیاری کرائی، اور نہ جب ایک بلا ٹوٹ پڑی تو اس پر غور و فکر کر کے مضبوط مگر ٹھنڈے انداز میں کوئی رہنمائی دی۔ کسی نے نہیں بتایا کہ اب جب کہ تم امواجِ حوادث میں ناگہانی طور پر گھر گئے ہو تو ان سے لڑ کر یا ان پر سوار ہو کر یا ان پر کوئی جہاز تیرا کر، کیسے عہدہ برآ ہو سکتے ہو۔

پس فوری طور پر باہر کے اس تاریخی طوفان کے مقابلے کے لیے ہم نے اپنے اندھے ہیجانات کی قوت کو میدان میں ڈال دیا۔ غیظ و غضب پھیلا ہوا ہے، نعرے لگ رہے ہیں۔ سڑکیں گھسائی جا رہی ہیں، دشمن کے پتلے اور اس کے ملکی جھنڈے جل رہے ہیں، خود اپنی قومی اور عوامی املاک کی تباہی بھی ہو رہی ہے۔ عراق کے لیے بھرتی کے دفتر کھل گئے ہیں ــــ اور یوں لگتا ہے کہ بس اسی غوغا آرائی سے امریکہ اور اس کے اتحادی مفتوح ہو رہے ہیں۔ ان کی مسلم دشمنی کے ڈنک کو کچلا جا رہا ہے۔

مگر بدقسمتی سے نہ کسی کو یہ معلوم کرسا رہا چکر کیا ہے؟ اس جنگی ڈرامے کا مصور، ایکٹر اور مسمسا ڈائریکٹر کون ہے؟ ظلم و استبداد کس کس نے کس کس پر کیا ہے؟ اس کے پیچھے کے تاریخی عوامل کیا ہیں اور آگے چل کر بڑی طاقتوں کا پروگرام کیا ہے؟ کس کو کس سے کٹنا اور کس سے جڑنا ہے؟ اور خود ہماری کیا گت بن سکتی ہے؟ نیز عراق میں جو رضاکار بھیجے جانے والے ہیں، ان کے لیے اجازت حاصل کی جا چکی ہے یا محض پروپیگنڈا اسٹنٹ ہے؟ ان کو آیا لائن بنانے کی بھی تربیت دی گئی ہے؟ وہ عراق جا کر کون سے جدید اسلحہ کو استعمال کرنے مہارت دکھائیں گے یا ان کو وہاں دو چار ماہ

کی ٹریننگ کس طرح دی جائے گی؟ وہاں کی حکومت ان کے لیے خوراک، لباس اور ادویہ کا کیا انتظام کرے گی؟ کیا ۵ لاکھ رضا کاروں کے لیے رسد کا انتظام وہاں ایک ہفتہ کے لیے بھی ہو گا یا کیا یہ لوگ آٹے کی بوریاں اور دالیں اور دوسری خشک رسد ساتھ لے جائیں گے؟ یا چند ماہ بھوک ہڑتال کی حالت میں لڑائی کر کے قوتِ ایمانی کا ایک نیا پہلو سامنے لائیں گے۔

جب ان سوالوں کو سامنے رکھتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ہم خوابوں اور سرابوں کی دنیا کے لوگ ہیں جنہیں اللہ نے منتّ کشِ عقل و تدبر ہونے سے فارغ کر دیا ہے اور جو دنیا کی دنیا کو محض اپنے جذباتی اُبال سے فتح کر سکتے ہیں۔

عالمی دشمن طاقتیں گو ہمارے حالِ زار سے پہلے بھی آگاہ ہیں، مگر انہوں نے عالمِ اسلام کے جسم میں شیطنت کے نیزے جو آنی چبھوئی ہے اس پر ہمارے ردِ عمل نے تھوڑے بہت مغالطوں کا امکان بھی ختم کر دیا ہے۔ ہمارے ذہنی دیوالیہ پن کا راز عین میدانِ معرکہ میں حریف پر فاش ہو گیا۔

دوسری دردناک حقیقت یہ ہے کہ "کویت — عراق — امریکہ" کی جنگِ مثلث نے تمام مسلم دنیا کو پھاڑ دیا ہے۔ چھوٹے موٹے داخلی روزمرہ معاملات میں تو ہمیشہ چخ چخ ہوتی ہی رہتی تھی، یہاں تک کہ شریعت بل پر بھی اختلافات کے پیچے لڑانے میں علماء اور جدیدیوں کے دونوں گروہوں نے بڑا مظاہرۂ فن کیا۔ مگر اب خلیجی قضیے کے عنوان سے ایک ملی معاملے میں ہمارے دینی علماء اور سیاسی دانش ور، اربابِ تحریر اور اصحابِ تقریر، مقتدرین اور ان کے مخالفین اپنی اپنی بولیاں اس طرح بولنے لگے جیسے ہر مسلمان ملک میں چاہِ بابل کا سا عالم ہو۔ وہی کیفیت کہ ع

شکرہ بر کنجشک و بر آہو پلنگ

ہر کوئی اپنی بات ٹھونستا ہے اور کسی دوسرے کی نہیں سنتا۔ سنتا ہے تو کسی دوسرے

سے کچھ اخذ نہیں کرتا - دو چار فریقوں کی رائیں بھی اپنی اپنی ہیں اور دلائل بھی اپنے اپنے سارے جتھوں کے قافلہ سالار بھی الگ ہیں - اخبارات پڑھیں تو ان کے بھی توڑے اور خبروں کی سرخیاں مختلف، مختلف شخصیتوں کی اہمیتیں مختلف ـــــ اور پھر تازہ خبر نہ ہو تو پچھلی خبروں کے لیے نئی نئی تصویریں جوڑ کر ان کے لیے نئے لفظوں میں سٹوریاں لکھوانا اور ان پر نئے عنوان جمانا، خبریت کا معیار یہ کہ کون انوکھی بولی بولتا ہے؟ کون کس پر سیاسی فقرہ بازی کا زیادہ مزے دار حملہ کرتا ہے - مرغوب ترین اطلاعات وہ جن کی رو سے کوئی آواز ملک کے خلاف اٹھے، یا یہ نہیں تو حکومت کے خلاف -

پھر ہر اہم شخصیت کی ذرا سی بات کو اپنا مستقل مورچہ بنا کر دوسری طرف گولہ باری شروع کر دینا، جیسے مرزا اسلم بیگ کے ایک معقول سے بیان کے گرد تفریقی دیوار کھڑی کر کے نصرت بھٹو صاحبہ مورچے میں مشین گن لے کر بیٹھ گئیں - کوئی کہتا ہے کہ اگر کویت کا ذکر بیچ میں لائے تو سمجھو کہ امریکی سازش کے ہاتھوں مارے گئے - کسی کا شعور یہ ہے کہ صدام بھی امریکی ڈرامے کا پہلے سے پسند کردہ حقیقت ناشناس ہیرو ہے - کسی کے منہ سے جھاگ اس بات پر اٹھ رہی ہے کہ ساری شرارت کویت اور سعودی عرب کی ہے، وہ اگر امریکہ کو نہ بلاتے تو کویت کا مسئلہ تو خود ہی مسلم امہ حل کر لیتی - جی ہاں! جیسے مسلم امہ نے اپنے پہلے سارے مسائل تو حل کر ڈالے ہیں - رہی مسلم امہ تو صدام منہ لگانے کو تیار نہیں ہے - بڑے بڑے طرم خاں پگڑیاں اس کے پاؤں پر رکھ کر بے نیل و مرام اس کی پناہ گاہ سے باہر نکلے تو بات رکھنے کو یہی بتایا کہ ـــــ "صدام ساڈا شیر ہے، باقی ہیر پھیر ہے" - وہ تو ایسا ضدم ضدا شخص ہے کہ ہفت اقلیم سے کیا، ہفت آفاق سے لڑنے کو تلا بیٹھا ہے - ہوا نان ایمان کا پتلا -

سو ایک کشمکش وہ ہے جو امن کی کوششیں کرنے والوں اور سڑکوں پر "تاک دھنا دھن تاک" کرنے والوں کے درمیان ہے - یہ کہتے ہیں کہ ص.ام کو جہاد فی سبیل اللہ سے روکنا اور امن مشن کا جھنڈا اٹھا لینا ملت سے غداری ہے - ایک اور جنگ یہ برپا ہے کہ بش کے پتلے جلانے والے اور صدام کی تصویریں اٹھائے سڑکوں پر

مارچ، بلکہ ڈبل مارچ، اور ساتھ ہی غل غپاڑہ کرنے والوں کے لیے سپاہیانِ ملت جب ذرا اچھی طرح گرم ہو جاتے ہیں تو پھر سارا بخار اپنی حکومت کے خلاف نکالتے ہیں کیونکہ امریکہ اور عراق کا فیصلہ تو نہ جانے کب اور کیا ہو، یہاں جو جہاد برپا ہے اس کا تو نتیجہ فوری نکل آنا چاہیے۔ پاکستان کے قصرِ اقتدار کو تو دو روز میں فتح کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ "سلطنت نازک تر آمد از حباب"۔ سو ہمارے غازیوں کی بعض رجمنٹوں اور ان کے سپہ سالاروں کی ساری جدوجہد فی الحال اس پر صرف ہو رہی ہے کہ اپنی حکومت پہ فتح پالی جائے، ملت کی فتح بعد میں ہوتی رہے گی۔ اور ہمارے ہاں پریس ایسا ہے کہ وہ استحکامِ ملک اور استحکامِ حکومت (جو جمہوری ہے) پر زور دینے کے بجائے اس کے خلاف گولہ باری کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کر کے گرمیٔ کارزار، اور اپنی گرمیٔ بازار کے اہتمام میں لگا ہوا ہے۔ بڑا نیک کام ہے۔

ذرا دیکھیے حال زار! ایک ملک کے اندر کتابِ وحدت کے اوراق بکھیر بکھیر، شیشۂ مے اخوت ریزہ ریزہ، صوبے صوبوں کے خلاف، دینی مدرسے مدرسوں کے خلاف، مولوی صاحب مولوی صاحب کے خلاف، ایڈیٹر صاحب ایڈیٹر صاحب کے خلاف، لیڈر صاحب لیڈر صاحب کے خلاف، عورتیں عورتوں کے خلاف، جلوس جلوسوں کے خلاف، نعرے نعروں کے خلاف! ــــ اور چلے ہیں عراق سے رشتہ جوڑنے اور امریکہ کا پتہ کاٹنے! ہمارے بعض امام تو ایسے ہیں کہ انہیں مکہ کے کعبے، مدینے کے روضے سے زیادہ عزیز بڑے پیر صاحب کا مزار واقع بغداد ہے۔ جہاں نجانے انہیں کس نے بتایا کہ صدام گیارھویں شریف کا اہتمام کرتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ آئندہ چند دن ٹھہر کیا، خود امریکہ بھی گیارھویں شریف کو قومی یا سرکاری تقریب بنا دیں۔

ہم تو ہمہ تن شکست ہیں، کسی اور کو کیا فتح دلوائیں گے۔ ہم تو تمام تر افتراق کا شکار ہیں۔ گھر میں تو ایک دوسرے سے سیدھے منہ بات نہیں کر سکتے۔ کہاں ہم ملت یا اُمہ کے اتحاد کے علم لہراتے پھر رہے ہیں۔

اتنا فریب، اتنا دھوکہ؟ اتنے تضاد؟ ــ کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں؟

ماشاءاللہ! ہم بڑی عظیم قوم ہیں اور ہم نے دنیا کے سامنے اسلامی تہذیب کو روشنی کا ایک مینار بنا کر کھڑا کرنے کا عہد کیا تھا، اب ذرا نصف صدی کے کارناموں پر نظر ڈال کر آج کی حالت دیکھیے۔

نظامِ امتحانات کو تہ و بالا کرنے کے لیے آپ کے ہاں جو عظیم الشان مجرمانہ کارروائی ہوتی ہے اور جس کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ کیا آپ نے اس پر غور کیا۔

کیا آپ نے بسنت کی پتنگ بازی کی بہار دیکھی جس پر کروڑوں روپے اُڑ گئے، عورتیں چھتوں پر کودتی پھریں۔ اکادکا بچے بڑے تو اس جہاد میں "شہادت" پا گئے، باقی صدہا زخموں کا ثواب سمیٹ رہے ہیں۔ ڈھول ڈھمکے کی دھنا دھن، کلاشنکوفوں کی تڑاخ پڑاخ اور لاؤڈ سپیکروں کی چیخم دھاڑ — یہ سب کچھ اس وقت ہو رہا تھا جب عراق پر آگ برس رہی تھی۔

آپ کی قوم کو اس غمناک سال میں بھی توفیق نہ ہوتی کہ ہزار اپیلوں کے باوجود کم سے کم اس مرتبہ پتنگ بازی نہ ہوتی۔ جب کہ خلیج میں کویت کے بعد عراق کی پتنگیں ٹوٹی جا رہی ہیں۔ اور ہزاروں عورتوں اور بچوں کے سانس کی ڈور کٹ رہی ہے۔ ہم سے تو آزادی کے ۵۰ سے زائد سالوں میں یہ بھی نہ ہوا کہ ہندوؤں کے اس تہوار کا نام ہی بدل کر "جشنِ بہاراں" یا کچھ اور رکھ لیتے۔ اور اس کے لیے اپنے ہاں تاریخ ایک دو دن پہلے یا پیچھے مقرر کر لیتے۔ اس شان سے ہم نے خلیجی احوال کر بناک میں ہمدردی ظاہر کی۔

آپ کے ہاں جو شادیاں ہو رہی ہیں۔ ان میں جہیز، مہر اور بری کے شاہی اخراجات کے علاوہ مہندی کی بدعتی رسموں اور ولیمہ کی مسنون روایت کے نام سے دولت اور خوراک کی جو بربادی ہوتی ہے، نیز شامیانوں، دریوں، قالینوں، صوفوں اور لائٹوں کے لیے جو کچھ خرچ کیا جاتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے یہاں سب سمگلر یا ہیروئن کے بیوپاری رہتے ہیں، جن کے قریب تک اسلام کبھی نہیں

بھٹکا۔ جو لوگ روایتی دیندار ہیں، وہ بھی دولت کے بارے میں انفرادی ملکیت کا ایک ہی قانون جانتے ہیں۔ انھیں نہ اسراف و تبذیر کا پتہ ہے، نہ طبقہ واریت پیدا کرنے والے استعمالِ دولت اور نمائشِ دولت اور کبرِ دولت کے بارے میں کچھ علم ہے، نہ انھیں یہ معلوم ہے کہ اسلام کے پاس ایک قانونِ تحدید بھی ہے اور دولت کا احمقانہ یا مفسدانہ یا مفادِ عامہ کے خلاف استعمال کرنے والے سفہا کے لیے قانونِ حَجر بھی ہے۔

پھر آپ نے لڑکیوں کو پھانس کر ناشائستہ حالت میں ان کی بلیو فلمیں تیار کرنے کے اسکنڈل کو بھی پچھلے دنوں پڑھا۔ آپ کے ہاں چلتی بسوں اور کاڑیوں پر ڈاکے ہوتے ہیں۔ بنک کٹتے ہیں، بم پھٹتے ہیں، عورتوں کا اغوا برائے فروخت ہوتا ہے اور دولت مندوں، عہدہ داروں اور سیٹھوں یا اُن کے بچوں کا اغوا برائے وصولیٔ تاوان۔ آپ لوگ جن کے ہاں تمام دروازوں کو کھولنے کی کنجی رشوت ہے، آپ جن کے تھانوں میں کوئی شخص سنگین سے سنگین جرم کر کے پہنچتا ہے تو اُس کے لیے لازماً اوپر سے ایسا جناتی ٹیلیفون آ جاتا ہے کہ اس کی ہتھکڑیوں اور حوالات کے دروازوں کے تالے کھُل جاتے ہیں۔ آپ کے ہاں عورت بن سنور کر معاشرے میں چلتی پھرتی ہے اور غریب طبقوں کے نوجوانوں میں اُکساہٹیں پیدا کرتی ہے، نیز فلمیں، رسائل و اخبارات کی تصویریں، اشتہارات کے ڈیزائن اور ٹیلی وژن کے پروگرام، وڈیو کیسٹیں، بلیو فلمیں اور جنسیت آلود شعر و ادب جب اُکساہٹوں کو طوفان وطغیان میں بدل دیتا ہے تو بار بار کی ان روزمرہ اکساہٹوں کا مقابلہ کرتے ہوئے عام لوگوں کی قوتِ مزاحمت جواب دے جاتی ہے اور اس بڑھتے ہوئے سیلاب کو ضمیروں کے کُشتے روک نہیں سکتے تو پھر جبر و اکراہ کا کوئی گندا واقعہ یہاں اور کوئی وہاں رونما ہوتا ہے۔ یقیناً ایسا کرنے والا مجرم ہے مگر اسے اُکساہٹیں دلانے کے بے شمار مجرم بھی تو مجرم ہیں۔ اندریں حالات بیچاری نسوانیت کا ناموس آئے دن لُٹتا رہتا ہے۔ اور اب تو اگر وہ پولیس کے سامنے جائے تو وہاں بھی خیر نہیں۔ اب تو جرائم

باہر سے نکل کر تھانوں میں پناہ لے رہے ہیں۔ اور اگلے دن ایک مجسٹریٹ کا قصہ پڑھ کر اندازہ ہوا کہ مجرم کی بلا تو عدالتوں میں بھی پناہ لے سکتی ہے۔

ایک اور نقطۂ نظر سے دیکھیں تو ہم لوگوں کے جسموں اور آنگنوں سے لے کر سڑکوں اور پارکوں تک ہر جگہ گندگی پھیلی ہوئی ہے۔ یہ وہی قوم ہے جس نے پہلی دفعہ یورپ کو صابن اور غسل سے آشنا کیا تھا۔ اب یہ حال ہے کہ اس کے کسی بھی گوشۂ زندگی میں صفائی باقی نہیں رہی ہے۔ وہ تجاوزات سے نجات پا نہیں سکتی۔ دوسرے شہریوں (یا حکومت یا کارپوریشن) کی جگہوں یا چیزوں پر بے دھڑک لوگ قبضہ جمائیں گے۔ ان کے گلے سے ہر حرام ایسے مزے سے اتر جاتا ہے جیسے وہ شیرِ مادر ہو۔ شرابی، جواری، زانی، طوائفیں، سود خوار، جعلی پیر اور ان کے طلسمات کا شکار ہونے والی نادان لڑکیاں اور قدیم عورتیں چپے چپے پر۔ بھنگی اور چرسی مجاوروں کی دکانیں مزاروں کی آڑ میں اور ان کے گرد گاہکوں کے ہجوم ہوں کے ہر گھٹیا سے گھٹیا بلکہ مجرمانہ تقاضے کے لیے سجدہ پاشی کے ساتھ اس طرح سوال کرتے ہوئے جیسے سامنے خدا بیٹھا ہو اور ہر فراڈی قبریہ دکاندار کو اس خیال سے زیادہ سے زیادہ فیس ادا کرتا ہے کہ کچھ حاجت حضرتِ قبلۂ حاجات کے سامنے ان کا یہ پرسنل سیکرٹری بھی کر دے گا۔

کیسی پستیاں ہیں جن میں ہم اُتر گئے ہیں اور مسلسل نیچے چلے جا رہے ہیں، نہ خود اُوپر اُٹھنا چاہتے ہیں، نہ کوئی دوسرا اُوپر اُٹھانے والا ہے۔ شاعر لذتِ نفس کے لیے غزل سرائیوں میں محو ہے۔ ادب افسانوں میں بڑی بڑی حقیقتیں لاتا ہے، مگر ہمارے گرد پھیلے ہوئے چٹانوں جتنے بڑے انگارے اسے دکھائی نہیں دیتے۔ خطیب ہے سو انتہائی اونچی آواز کے لاؤڈ اسپیکر مسجد میں لگوا کر حاضرین ہوں تو آدھی رات تک خود تقریر کرتا ہے اور دوسروں سے نعتیں پڑھواتا ہے۔ حاضرین نہ ہوں تو جلوں جلوسوں، تقریروں اور نعتوں کے کیسٹ لگا دیتا ہے۔ آس پاس کے لوگوں کے حالات، ضروریات اور آرام کا کوئی خیال نہیں ہے اور نہ بچارے

کو دکھی انسانیت کے حقیقی مصائب اور لپسپائیوں کا علم و احساس ہے۔ ایسی دنیاوی باتیں وہ کبھی نہیں کرتا۔

یہ ہے پاکستان کی ملّتِ اسلامیہ جو کہیں جلسوں میں ناچ ناچ کر، کہیں سڑکوں پر اُچھل اُچھل کر عراق عراق اور امریکہ امریکہ پکار رہی ہے۔ گویا یہ عراق کے حق میں محوِ جہاد ہے اور امریکہ کو شکست دے رہی ہے۔ کاش کہ اسے اپنے حالِ زار کا علم ہوتا اور یہ سنبھل سکتی۔

یہی حال ایک ایک ملک میں ہمارا ہے۔ حکومتیں اور جماعتیں اور محراب و منبر، اخبارات و مطبوعات اور اشخاص و رجال ایک دوسرے سے ٹکرا رہے ہیں اور ساری ملّت تقسیم ہو گئی ہے۔ کتنی بڑی کامیابی ہے امریکہ اور اس کے حواریوں اور استعماریوں اور صلیبیوں اور صہیونیوں کی کہ ہم ایسے اصول نہیں رکھتے کہ ہم فوراً دو یا تین نکات پر یا پانچ چھ پر جمع ہو کر ڈٹ جاتے۔ اور ترکی سے مراکش، مراکش سے انڈونیشیا، اور انڈونیشیا سے پاکستان، پاکستان سے ایران اور ایران سے عراق اور عراق سے کویت اور سعودی عرب تک ہماری ایک فکر ہوتی اور اس پر مبنی ایک صف بن جاتی۔

لیکن ہماری یہ ملّی صفِ اتحاد ٹوٹے مدّتیں ہو گئیں، بے شمار شکستوں نے، پھر استعماری طاقتوں کے نفوذ نے، طرح طرح کے مفاد اور اندیشوں نے، ٹوٹ ٹوٹ کر بننے والی سرحدوں نے، مغرب پرستوں اور مخالف مغرب قوتوں کے تصادم نے، جدید لادین اور بے معیار جمہوری سیاست اور اسلامی نظریۂ خلافت و شوریٰ کے ٹکراؤ نے، معاشی ضرورتوں اور احتیاجوں نے، ہمیں مدّتوں سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے۔

ع ٹکڑے ٹکڑے جس طرح سونے کو کر دیتا ہے گاز

آج تمام مسلم ممالک و اقوام کی اپنی اپنی دیواریں ہیں، اپنے اپنے نظریے اور عقیدے ہیں، اپنے اپنے تعصبات اور تاریخی زخم ہیں۔ روسی اور امریکی استعمار

ہیں تقسیم ہو جانے کی وجہ سے الگ الگ معیارات ہیں۔ پھر سعودی عرب کے شمال کا ایک لمبا خطہ ایسا ہے جہاں جا کر آپ اسلام اسلام اور ملت ملت پکار کر کتنا بھی اُچھلیں، ایسے ایسے شدید مخالفِ اسلام اور نقیضِ ایمان نظریات کا غلبہ ہے کہ جنگ کی شورا شوری اور جذباتی ہیجانات سے نکل کر اگر کچھ لوگ اس بارے میں ریسرچ کر سکیں کہ دروزی اور نصیری کن معتقدات پر قائم ہیں تو پھر آپ کو اندازہ ہو کہ وحدتِ ملت کا خواب پورا کرنے کے لیے آج تک کیوں کوئی راہ نہیں نکل سکی۔ پھر آپ اپنی اس شانِ افتراق کے ساتھ کس طرح اُچھل رہے ہیں؟ کس خوشی میں غوغا آرائی کر رہے ہیں؟ جوش و خروش کی طغیانیاں کیا حقیقت رکھتی ہیں؟

ہمارے دشمن ہماری بیماریوں اور کمزوریوں سے خود ہمارے مقابلے میں زیادہ واقف ہیں۔ مزید بھد کرانے کی کیا ضرورت ہے؟

اگر اسلام کی بنیادوں پر صفِ وحدت استوار کرنی ہے (جو شرعاً لازم ہے) تو پھر گستاخی معاف! آپ اس معاملے میں قرنوں سے شکستیں کھا رہے ہیں۔ اور بارہا مسلمانوں کے مونہوں پر مسلمانوں کے طمانچے پڑ چکے ہیں۔ آج بھی یہی حال ہے۔

اصل سوال یہ ہے کہ آیا اسلام بیچ میں مؤثر طور پر دخیل ہوتا ہے یا نہیں؟ ہو تو کیسے ہو جب کہ سو دو سو سال سے آپ کبھی اس کا منہ نوچتے ہیں، کبھی مسخ و تحریف کرتے ہیں، کبھی اسلام کا نام لینے والوں کو ملّا ملّا کہہ کر گالیاں دیتے ہیں۔ کبھی آپ کو اسلام سے زیادہ اہم آپ کے پسندیدہ مختارات اور اجتہادات محسوس ہوتے ہیں۔

تو پہلے اسلام کی بنیادوں پر ملت کی سچی صفِ وحدت قائم کر لیجیے، پھر کوئی اور بات کیجیے گا۔

سلسلۂ کلام درحقیقت یہاں ختم نہیں ہو جانا چاہئے تھا۔ بلکہ دو تین اہم پہلو اور بھی بحث و نظر کے باقی ہیں، مگر میرے پاس زائد صفحات اور زائد قوتِ کار نہیں ہے۔ پس یہاں تک کی گفتگو جن چیزوں پر غور کرنے اور جن کمزوریوں پر توجہ کرنے کی دعوت دیتی ہے، کاش کہ کچھ لوگ اس مخلصانہ دعوت کو صدقِ دل سے قبول کر کے سچے دل سے ملت کی صلاح و فلاح کی راہیں تلاش کریں۔

حکمتِ سیّد مودودیؒ

روزہ کی تربیتی اہمیت

(۱۹۳۸ء)

اِسلام کا اصل مقصد صالحین کی ایسی جماعت بنانا ہے جو انسانی تمدّن کو خیر و صلاح کی بنیادوں پر تعمیر کرے۔ مگر اس غرض کے لیے وہ صرف اجتماعی اُصول وضع کرنے اور ان اُصولوں کی بنیاد پر ایک نظامِ تمدّن بنا دینے پر اکتفا نہیں کرتا، بلکہ ساتھ ساتھ اپنے جماعتی نظام کے لیے افراد کو تیار کرنے کا بھی انتظام کرتا ہے تاکہ جماعت (سوسائٹی)، جن افراد پر مشتمل ہو ان میں کا ایک ایک شخص اپنے خیالات، اپنی سیرت اور کردار کے لحاظ سے اس نظام کے ساتھ بیش از بیش موافقت رکھتا ہو۔ اور باغیانہ میلانات کے ساتھ مجبورانہ اطاعت کرنے کے بجائے اپنے نفس و روح کی پوری آمادگی، اپنے دل و دماغ کے مخلصانہ عقیدے، اور اپنی سیرت کی ذاتی قوت کے ساتھ اس کی پیروی کرے۔ اس اسکیم میں روزے کے رُکن سے جو کام لیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ:

۱۔ اِس تربیت کے ذریعے سے جماعت کے ہر فرد کو خداوندِ عالم کی حاکمیت کے مقابلے میں اپنی خود مختاری سے عملاً دست بردار ہو جانے کے لیے تیار کیا جائے، تا آنکہ وہ اپنی زندگی کو الٰہی قانون کے تابع کر دے۔

۲۔ ہر فرد کے ذہن میں خدا کے عالم الغیب والشہادۃ ہونے کا اور آخرت کی باز پُرس کا عقیدہ عملی مشق و تمرین کے ذریعے سے اس طرح جاگزیں کر دیا جائے کہ وہ خود اپنی شخصی ذمہ داری کے احساس کی بنا پر، نہ کہ کسی خارجی دباؤ کی وجہ سے، قانونِ الٰہی

کی خفیہ اور علانیہ اطاعت کرنے لگے۔

۳۔ ہر فرد کے اندر یہ رُوح پھونک دی جائے کہ وہ ماسوا اللہ کی بندگی و اطاعت سے اعتقاداً و عملاً منکر ہو جائے اور اس کی بندگی اللہ کے لیے اس طرح خالص ہو جائے کہ جس حکم یا جس قانون یا جس اقتدار کے لیے اس کی طرف سے کوئی سند نہ ہو، اس کی اطاعت کے لیے فردِ مومن کے نفس میں کوئی آمادگی بھی نہ ہو۔

۴۔ ہر فرد کی اخلاقی تربیت اس طور پر کی جائے کہ اسے اپنی خواہشات پر عملاً پورا اقتدار حاصل ہو، وہ اپنے نفس و جسم کی تمام قوتوں پر اتنا قابو رکھتا ہو کہ اپنے عقیدے اور علم و بصیرت کے مطابق ان سے کام لے سکے۔ اس میں صبر، تحمل، جفاکشی، توکل علی اللہ اور ثابت قدمی و یک سُوئی کی صفات پیدا ہو جائیں۔ اور اس کے کیرکٹر میں اتنی قوت آجائے کہ وہ خارجی ترغیبات اور اپنے نفس کے ناجائز میلانات کا مقابلہ کر سکے۔

یہی وہ مقاصد ہیں جن کے لیے اسلام نے رمضان کے روزے ہر اُس شخص پر فرض کیے ہیں جو اسلامی جماعت کا رُکن ہو۔ کوئی عاقل و بالغ فرد خواہ وہ عورت ہو یا مرد، اس فریضہ سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ بیماری، سفر اور بعض دوسرے شرعی عذرات کی بنا پر کوئی شخص اس فرض کو ادا نہ کر سکتا ہو، تو اس پر قضا یا فدیہ لازم ہے۔ بہرحال اسلام کے دائرے میں رہ کر کوئی انسان روزے کی فرضیت سے چھوٹتا نہیں ہے۔

(اسلامی عبادات پر تحقیقی نظر، ص ۷۲-۷۳)

اسلامی معاشرہ کی تشکیل میں

عقائد و اخلاق کا مقام

جناب ڈاکٹر محمد یوسف فاروقی صاحب۔ ترجمہ: عذرا نسیم فاروقی

(۲)

عقیدۂ توحید اور معاد کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ قرآن حکیم نے نیک عمل اور فضائل اخلاق کو بھی بہت مؤثر انداز میں ذکر کیا ہے، مکی دور کے تقریباً تیرہ سال تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وحی متلو اور سنت کے ذریعے لوگوں کو عقیدہ و اخلاق کی تربیت دیتے رہے۔ دورِ نبوت کا ایک طویل عرصہ تعلیم و تربیتِ اخلاق پر صرف کرنا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اسلامی معاشرہ کی تعمیر و تشکیل عقیدہ و اخلاق کے بغیر ممکن نہیں۔ عہدِ رسالت میں عقائد کی تربیت اس انداز سے کی گئی تھی کہ زندگی کے ہر شعبہ میں اور تہذیب و تمدن کے تمام مظاہر میں عقائد کی چھاپ گہری اور نمایاں تھی۔

قرآنِ حکیم کے انداز بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اچھا عمل بذات خود تعمیری اور تخلیقی ہوتا ہے۔ اچھا عمل کرنے والے کو اس کی جزا اسی حساب سے ملے گی کہ اس کے عمل کے اثرات کا دائرہ کتنا وسیع ہے۔ نیز یہ کہ اس عمل کو بجا لانے میں فاعل کس قدر مخلص اور سنجیدہ تھا۔ کم سے کم مقدار نیکی کے صلہ کی دس گنا بیان کی گئی ہے۔ دوسری طرف بُرا عمل بذاتِ خود منفی اور تخریبی ہوتا ہے اور اس طرح عملِ بد کرنے والے کو جزا سے محروم کر کے سزا کا مستحق بنا دیتا ہے، لیکن صرف اتنا ہی سزا کا مستحق ٹھہراتا ہے جتنا عمل ہوتا ہے۔ مکافاتِ عمل کے دن ایک بُرائی ایک ہی تصور ہوگی۔ دوسرے الفاظ میں ہر عمل کا ایک اثر

اور نتیجہ ہوتا ہے، اچھا یا برا۔ ہم سب کو اپنے اعمال کا نتیجہ دیکھنا ہوگا اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ دنیا میں قومیں اپنے اخلاق و کردار کا نتیجہ اجتماعی طور پر برداشت کرتی ہیں۔ اگر مجموعی طور پر کسی قوم کا عمل درست ہو اور ان کا اخلاقی معیار بلند ہو تو وہ قوم اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کی مستحق ٹھہرتی ہے، اُسے خلافتِ ارض کا اعزاز عطا ہوتا ہے۔ لیکن اگر مجموعی طور پر بدعملی اور بداخلاقی کا شکار ہو جاتے تو بہت سے مصائب میں گرفتار ہو جاتی ہے۔ ایسی بہت سی اقوام عذابِ الٰہی میں گرفتار ہو کر نیست و نابود کر دی گئیں۔ البتہ آخرت میں حساب و کتاب بالکل انفرادی ہوگا۔ ہر فرد اپنے نامہ اعمال کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عدالت میں پیش ہوگا۔

خلیفہ عبدالحکیم نے اس موضوع پر اچھی بحث لکھی ہے۔ اُن کے خیال میں اچھائی کا مفہوم عقیدہ اور عمل کے تطابق میں پنہاں ہے۔ بقول خلیفہ نیکی صفتِ الٰہی کا پرتو ہے۔ اللہ تعالیٰ خالق ہے لہٰذا اچھے عمل کو تخلیقی و تعمیری ہی ہونا چاہیے۔ کوئی چیز بھی اس قدر تخلیقی نہیں ہو سکتی جس قدر ایک فعال اور ہوشمندانہ عملِ خیر۔ نیکی کوئی ساکت و جامد چیز نہیں ہے۔ بلکہ متحرک و فعال ہوتی ہے۔ اس کا تعلق محض علم ہی نہیں بلکہ افعال سے بھی ہے، جو حق و صداقت کو عمل کا روپ دیتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے۔ امام ترمذیؒ نے حضرت ابوالدرداؓ کی روایت کردہ حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن جب حساب و کتاب ہوگا تو حسنِ خلق سے زیادہ قابلِ قدر کوئی چیز نہ ہوگی۔ اس حدیث کو ابوداؤد نے اپنی السنن میں اور امام احمد بن حنبلؒ نے اپنی مسند میں نقل کیا ہے۔ امام ترمذی کے مطابق اس حدیث کا شمار صحیح احادیث میں ہوتا ہے۔

اسلام میں عقیدہ اور اخلاقِ حسنہ کے بلند ترین درجہ کی وضاحت احسان کی اس تعریف سے بھی ہوتی ہے جو مشہور حدیث جبریل میں بیان ہوئی ہے۔ اسوتزو IZUTSU نے احسان کا بڑا صحیح ترجمہ کیا ہے۔ (PERFECTION) کمال یا تکمیل۔

ایک حدیث کے ان الفاظ میں غور کریں تو یہ مفہوم بہت صحیح معلوم ہوتا ہے، الفاظ یہ

ہیں، اَسْلَمَ فَاَحْسَنَ اِسْلَامَهٗ اس نے اسلام قبول کیا اور اسلام میں درجہ کمال کو پہنچ گیا۔

قرآن حکیم میں والدین کے ساتھ عزت و احترام اور حسنِ سلوک میں بھی احسان کا حکم دیا گیا ہے۔ قرآن و سنت میں عقیدہ و اخلاق کی تعلیم و تربیت اُمّتِ مسلمہ کو اخلاق و کردار کے بلند ترین مقام تک پہنچاتی ہیں۔ یہ عظیم تر مقام اصطلاحِ شرع میں احسان کہلاتا ہے امام ابن تیمیہؒ نے دین کے تین مدارج بیان کئے ہیں۔ دین میں بلند ترین مقام جو ایک مومن حاصل کر سکتا ہے، وہ درجۂ احسان ہے"۔ قرآن حکیم میں بھی یہ اصطلاح اسی مفہوم میں استعمال ہوتی ہے۔ مثلاً سورۂ بقرہ میں ارشاد ہے:

بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ؕ (البقرہ - ۱۱۲)

"ہاں! جس نے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے لیے سونپ دیا اور وہ محسن بھی ہے (یعنی عبادت و اخلاق میں درجۂ احسان کو پہنچ گیا ہے) تو اس کا صلہ اس کے رب کے پاس ہے۔ ایسے لوگ (قیامت کے روز) نہ خوف زدہ ہوں گے، نہ ہی غمگین ہوں گے"۔

اسی طرح سورہ النحل کی آیت: اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ ۙ (النحل - ۹۰) اللہ تعالیٰ احسان و عدل کا حکم دیتا ہے۔ ہمارے قدیم مفسرین ان آیات کی تفسیر کرتے ہوئے احسان کا مفہوم اخلاص یا اپنے اعمال کو اخلاص و آداب کے ساتھ مزین کرنا بتاتے ہیں۔

سورۃ الاسراء آیات وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ (تمہارے رب کا یہ فیصلہ ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو) آیت نمبر ۲۳ سے آیت نمبر ۳۰ تک غور سے پڑھیئے، اسی طرح سورۃ الفرقان کی آیات نمبر ۶۱ سے سورۃ کے اختتام تک جن میں عباد الرحمٰن کے اوصاف و کردار کو بیان کیا گیا ہے۔ ان آیات میں عقائد اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کی تعلیم ساتھ ساتھ دی گئی۔ قرآن حکیم کے یہ دونوں اقتباسات انسانی زندگی

کے تقریباً تمام پہلوؤں پر محیط ہیں خواہ وہ انفرادی ہوں یا اجتماعی۔

مدنی سورتوں میں معاشرتی احکام، سیاسی معاملات اور انتظامی امور پر بھی توجہ دی گئی ہے۔ اس لیے کہ مدینہ منورہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مستحکم اسلامی معاشرہ قائم کر لیا تھا۔ اور ایک اسلامی مملکت وجود میں آگئی تھی۔ مدینہ منورہ میں اسلامی معاشرہ اور اسلامی مملکت مکمل طور پر عقائد اور اخلاقی اقدار کی بنیاد پر قائم ہوا تھا۔ مدنی دور کی ان آیات پر غور وفکر کیجیے جو بدر و احد کے فوراً بعد نازل ہوئی تھیں۔ ان آیات میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ وہ یتیموں اور بیواؤں کی دیکھ بھال کریں۔ زکوٰۃ کا نظام قائم کیا گیا، انصار و مہاجرین کے درمیان مواخات کرائی گئی۔ یہ تمام ادارے بغیر کسی دشواری اور بغیر کسی مشکل کے باحسن و خوبی کام انجام دینے لگے اس لیے کہ ان کے پیچھے عقائد کی قوت تھی، جو آمادۂ عمل رکھتی تھی۔ رسول اللہ کی ۱۳ سالہ مکی دور کی اخلاقی تربیت تھی۔ جس نے لوگوں کے دلوں میں طاقت ور ضمیر پیدا کر دیا تھا۔ تاہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عقیدہ و اخلاق کی تعلیم و تربیت مدنی دور میں بھی جاری رکھی۔ مثال کے طور پر آپ نے فرمایا۔ "تم مومن نہیں ہو سکتے جب تک اللہ اور اس کے رسولؐ تمہیں اپنے اہل، اپنی جان اور اپنے مال سے زیادہ محبوب نہ ہوں۔" اور "مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ ہوں۔" یا "وہ شخص مومن نہیں جو خود تو شکم سیر ہو کر سوئے اور اس کا پڑوسی بھوکا رہے۔"

اُصولی طور پر مدنی دور کی سورتیں ان احکامات و ہدایات پر مشتمل ہیں جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ لوگ اجتماعی طور پر کیسے امن و سلامتی کے ساتھ رہ سکتے ہیں۔ معاشرتی نظم و ضبط سے متعلق ہدایات دی گئی ہیں۔ لیکن ان ہدایات کے ساتھ ساتھ عقائد و اخلاق کی اہمیت کو بھی جا بجا بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً مدنی سورۃ الحجرات میں بنیادی عقائد کے ساتھ ان اخلاقی اقدار کی تعلیم دی گئی ہے جو ایک صالح معاشرہ کے قیام کے لیے ناگزیر ہیں۔

اسی طرح سورہ الممتحنہ میں آیات بیعۃ بھی بہترین مثالیں ہیں۔ ان میں توحید، اخلاقیات کو ساتھ ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسلام قبول کرنے والوں

سے توحید اور ان کے اخلاقی اقدار پر عمل کرنے پر بیعت لیا کرتے تھے۔ جس کا ذکر الممتحنہ کی آخری آیات میں کیا گیا ہے۔ خواتین سے بھی ان باتوں پر بیعت لی جاتی تھی کہ وہ ان اقدار پر عمل کریں گی:

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا جَاءَكَ الْمُؤْمِنَاتُ يُبَايِعْنَكَ عَلَىٰ أَن لَّا يُشْرِكْنَ وَلَا يَزْنِينَ وَلَا يَقْتُلْنَ أَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَأْتِينَ بِبُهْتَانٍ يَفْتَرِينَهُ بَيْنَ أَيْدِيهِنَّ وَأَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِينَكَ فِي مَعْرُوفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللَّهَ ۖ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝ (الممتحنہ -۱۲)

"اے نبیؐ! جب مومن خواتین تمہارے پاس بیعت کرنے کے لیے آئیں اور وہ اس بات پر بیعت کریں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھیرائیں گی، نہ چوری کریں گی، نہ زنا کریں گی، نہ اپنی اولاد کو قتل کریں گی، نہ اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے درمیان سے متعلق کوئی بہتان تراشیں گی، اور نہ کسی اور معروف میں آپؐ کی نافرمانی کریں گی۔ تو آپ ان سے بیعت لے لیں، اور ان کے لیے دعائے مغفرت کریں، یقیناً اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔"

بیعت عقبہ اولیٰ کے موقع پر یہی بیعت یثرب سے آنے والے وفد کے لوگوں سے لی گئی تھی۔ اہلِ مدینہ نے جو عہد اس بیعت کے موقع پر کیا تھا اسے تمام زندگی نبھایا۔ حضرت جعفر بن ابی طالبؓ کا وہ بیان جو انہوں نے نجاشی کے دربار میں دیا تھا، ایک شاہکار مثال ہے۔ جعفر بن ابی طالب کا یہ بیان اس بات کی شہادت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ماننے والوں میں عقیدہ و اخلاق کو پوری طرح راسخ کر دیا تھا۔
اس طرح اسلامی عقائد مومن کے دل و دماغ میں جو کیفیت پیدا کرتے ہیں، وہ کیفیت تقویٰ کہلاتی ہے اور اہلِ ایمان کے کردار کو ایک خاص رُخ عطا کرتی ہے۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عقاید و اخلاق کی بنیادی اہمیت سے پوری طرح واقف تھے۔ یہ بات آپؐ پر پوری طرح عیاں تھی کہ فرد اور اجتماع پر عقائد کے گہرے اثرات

ہوتے ہیں۔ عقائد ہی کی تعلیم نے مسلم معاشرے کو پوری طرح اسلامی رنگ میں ڈھال دیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ نے وحی قرآن کو نہ صرف سینوں اور حافظوں میں محفوظ کر لیا تھا، بلکہ اپنی عملی زندگی میں اس کی صحیح تفسیر پیش کی۔ کَانَ خُلُقُهُ الْقُرْاٰنُ" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل اور اخلاق قرآن کریم کی عملی تفسیر تھی۔ انبیاء علیہم السلام منصب رسالت پر فائز ہو کر یہ اہم فریضہ سب سے پہلے انجام دیتے ہیں۔ تعلیم کتاب وحکمت اور تزکیۂ نفس انبیاء کے فرائض میں داخل ہوتا ہے۔ بعض یہودی اور عیسائی مستشرقین نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم محض ایک قابل سیاست دان تھے یا ایک (SOCIAL REFORMER) معاشرتی مصلح جن کے پاس ایک پورا منصوبہ تھا، جسے آپؐ نے وقتاً فوقتاً نافذ کیا۔ اس قسم کی باتیں عام طور پر مقام نبوت سے توجہ ہٹانے کے لیے کی جاتی ہیں۔ انبیاء علیہم السلام یقیناً معاشرے کے سب سے بڑے مصلح ہوتے ہیں، اور یقیناً ان کی سیاسی بصیرت بہت زیادہ ہوتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں تمام اعلیٰ صفات بدرجۂ اتم موجود تھیں۔ منصب نبوت پر فائز تو ہوتا ہی انسانِ کامل ہے۔ اس کے تمام تشریعی اقدامات اور تعمیری اصلاحات اللہ کے رسول کی حیثیت میں انجام پاتی ہیں۔

مدینہ منورہ میں جو اسلامی معاشرہ تشکیل پایا تھا، یا ایک منظم مملکت وجود میں آئی تھی وہ لازمی اور منطقی نتیجہ تھا اس تعلیم وتربیت کا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکی اور مدنی دور میں فرماتے رہے۔ قرآن حکیم کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اُمتِ مسلمہ کے لیے ایک مثالی نمونہ ہے۔ آپؐ کی زندگی کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہو جائے گا کہ عقیدہ کی گرفت کس قدر مضبوط تھی۔ ماثور دعاؤں کو دیکھ لیجیے پتہ چل جائے گا کہ آپؐ کا یقین کتنا محکم تھا۔ خالق اور عبد کا تعلق بھی عیاں ہو جائے گا جہاں تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق وکردار کے معیار کا تعلق ہے تو ہمارے سامنے آپ کی عائلی زندگی کی تفصیلات بھی ہیں اور معاشرتی واجتماعی زندگی کے بھی تمام پہلو محفوظ ہیں۔ اُمتِ مسلمہ کا اجماع ہے کہ آپؐ بلند ترین اخلاق کے

مالک تھے ۔ قرآن حکیم کی شہادت ہے کہ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ یقیناً آپؐ اعلیٰ اخلاق و کردار کے مالک ہیں ۔ ۔ امام مالکؒ نے وہ حدیث بیان کی ہے جس کی رو سے آپؐ کی بعثت کا مقصد ہی اعلیٰ اخلاق کی تکمیل تھا ۔

یہاں ان تمام قرآنی آیات اور احادیثِ نبویؐ کا ذکر کرنا مشکل ہوگا، جو عقائد کی بنیادی اہمیت اور اخلاقیات سے متعلق ہیں ۔ اس لیے کہ قرآن و سنّت کا بہت بڑا حصہ انہیں پر مشتمل ہے ۔ تاہم دو ایک احادیث بطور مثال ہم بیان کرتے ہیں ، جن سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر ایمان ، عمل صالح اور اخلاق و کردار میں کتنا گہرا ربط ہے ۔ ترمذیؒ ، ابوداؤدؒ اور امام احمدؒ بن حنبلؒ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ "مومن کامل وہ ہے جو بہترین اخلاق کا مالک ہے" ۔ اسی طرح "جس میں امانت کا پاس نہیں اس کا کوئی ایمان نہیں" ۔ اسی طرح صحاح ستہ کی ایک حدیث قابلِ غور ہے جو عقیدۂ ایمان کے جوہر کو ظاہر کرتی ہے ۔ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ "دین اخلاص کا نام ہے" ۔ یہ بات آپؐ نے تین مرتبہ فرمائی ۔ صحابہ کرام نے عرض کیا ، یا رسول اللہ! کس کے ساتھ؟ آپؐ نے جواب دیا ۔ اللہ کے ساتھ ، اس کے رسول کے ساتھ ، (مسلمانوں کے) امیر کے ساتھ اور تمام لوگوں کے ساتھ" ۔ امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ نے یہ روایت کتاب الایمان میں ذکر کی ہے ۔ امام ترمذیؒ نے کتاب البر اور ابوداؤدؒ نے کتاب الآداب میں ۔ گویا محدثین کی رائے میں یہ حدیث ایمان ، عمل صالح اور اخلاق و کردار کے باہم اثرانداز ہونے کو بھی واضح کرتی ہے ۔ عقائد اعمال صالحہ اور اخلاقِ حسنہ کو پیدا کرتے ہیں اور اعمالِ صالحہ اور اسلامی آداب ایمان میں اضافہ کا سبب بنتے ہیں ۔ اس طرح دونوں مل کر معاشرہ میں اپنا تعمیری کردار ادا کرتے ہیں ۔ فرد اور معاشرہ دونوں میں ارتباط ہوتا ہے ۔ ایمان و عمل اور اخلاق ہی کے ذریعے سے انسان مقامِ احسان کو حاصل کرتا ہے ۔ قرآنی تعلیمات کے مطابق ایمان قطعی اور مکمل یقین کا نام ہے جو انسان میں بھرپور اعتماد اور مضبوط ارادہ پیدا کرتا ہے ۔ یہی ایمان انسان کو تعمیری اور صحت مند سرگرمیوں پہ آمادہ رکھتا ہے ۔ اس طرح سے مقصد تخلیق یا فرائض خلافت کی ذمہ داریوں کو بہتر طریقہ سے انجام دے سکتا ہے ۔

اسلامی معاشرہ میں ماں کا درجہ

محترمہ ثریا بتول علوی صاحبہ - منصورہ - لاہور

(۳)

تاریخ اسلام میں ماں کا مقام الغرض تاریخ اسلام بہادر ماؤں کے ایسے زریں کارناموں سے بھری پڑی ہے۔ جہاں ماں نے اپنی ممتا کو رضائے الٰہی پر قربان کر دیا تھا ۔ وہ بچوں کو علمِ دین کے حصول کے لیے دُور دراز سفروں پر بھیجتیں ۔ دشمن سے لڑنے اور جہاد کرنے کے لیے اُن کو اُبھارتیں ۔ جذبۂ شہادت کو ان کا مطلوب و مقصود بناتیں ، بلکہ میرا تو اندازہ یہی ہے کہ تاریخ میں جس مومن نے بھی کارہائے نمایاں انجام دیئے اس کی اگر چھان بین کی جائے تو اس کی تہ میں اس کی والدہ ماجدہ کی مومنانہ تربیت کا رنگ جھلکتا نظر آئے گا ۔ محمد بن قاسم ، طارق بن زیاد ، محمد فاتح اور صلاح الدین ایوبی کو دیکھ لیجیے ، عہدِ قریب کی مثال شاعرِ مشرق علامہ اقبال کی ہے ۔ جن کی والدہ ماجدہ نے ان کی پیدائش پر ایک بکری منگوا کر رکھ لی ۔ شوہر نے پوچھا یہ کیا تو بولیں تمہاری آمدنی مشکوک ہے اس لیے میں اپنے دُودھ سے اپنے بچے کی پرورش نہیں کر سکتی ، لہٰذا اسے بکری کا حلال دُودھ پلایا کروں گی ۔ اس پر نیک دل شوہر نے اپنا مشکوک پیشہ ترک کر دیا ۔ سر سید احمد خاں کا مشہور واقعہ ہے کہ بچپن میں اپنے ملازم کے بچے کو مارا تو ماں نے گھر سے نکال دیا ، اور پھر جب تک اس ملازم کے بچے سے سر سید نے معافی نہ مانگ لی ، اور آئندہ تنگ نہ کرنے کا وعدہ نہ کیا ، ان کو گھر میں نہ آنے دیا ۔

امرِ واقعہ یہ ہے کہ عورت اپنے گھر کی ملکہ ہے ۔ وہ اپنے گھر کی ایسے ہی ذمہ دار

ہے جس طرح کوئی بادشاہ اپنی سلطنت کا۔ عورت کے گھر کے اندر موجود ہونے سے گھر میں ایک رونق ہوتی ہے۔ بچے کہیں کھیل رہے ہیں، کہیں پڑھ رہے ہیں۔ مہمان آ رہے ہیں، جا رہے ہیں۔ ایک رونق ہے ایک دنیا آباد ہے۔ گھر کے ماحول پر ماں کے ذاتی کردار اور اس کی اخلاقی قدروں کی گہری چھاپ ہے۔ بچے مدرسے سے تعلیم حاصل کر کے آتے ہیں تو گھر ان کی اخلاقی تربیت گاہ ہوتے ہیں۔ جہاں ان کی کڑی نگہداشت ہوتی ہے۔ وہ بڑوں کے طور طریقے دیکھتے اور ان سے سبق حاصل کرتے ہیں۔ اگر وہ کوئی غلطی کرتے ہیں تو انہیں مشفقانہ انداز میں ٹوکا جاتا ہے کہ آئندہ اس کام سے باز رہیں۔

عورت اور مغربی معاشرہ

مگر افسوس یہ ہے کہ آج مسلمان عورت بھی مغربی عورت کی نقالی میں مردوں کے دوش بدوش چلنا چاہتی ہیں۔ حالانکہ مغربی عورت کی غلامی بنام آزادی کے بڑے مہلک نتائج برآمد ہو رہے ہیں۔ مثلاً گھروں کی ویرانی، بے حیائی و فحاشی کی کثرت، زناکاری، ناجائز حمل، اسقاطِ حمل، بن باپ کے بچے اور بچوں میں احساس محرومی و تشدد وغیرہ۔ مغرب کی اس نام نہاد آزادی کا سب سے زیادہ نقصان نسلِ نو کو پہنچتا ہے جو مستقبل کی معمار ہوتی ہے۔ عورت اگر ملازمت کرتی ہے یا کلب جوائن کرتی ہے یا سماجی کارکن بنتی ہے۔ بہر صورت گھروں کے ادارے ویران ہو جاتے ہیں۔ اور بچے لاوارث ہو جاتے ہیں۔ وہ ہوٹلوں کا کھانا کھا کر اکتا جاتے ہیں۔ اور ماں کے شفقت بھرے لمس کو ترس جاتے ہیں۔ مسلسل ماں کی نگہداشت سے محروم اور اخلاقی تربیت سے عاری بچے بالآخر بے مروت، بد لحاظ، جرائم پیشہ، بے حیا اور متشدد بن جاتے ہیں۔ مار دھاڑ اور قتل و غارت کے عادی بچے پھر نشہ کی گود میں عافیت ڈھونڈتے ہیں۔ گویا ماں کی غفلت کا سارا خمیازہ معصوم ذہنوں کو بھگتنا پڑتا ہے۔ ایک امریکی مصنفہ مسز ہڈسن اپنی کتاب "سیکس اینڈ کامن سینس" میں لکھتی ہے۔ "ہماری تہذیب کی دیواریں منہدم ہونے کو ہیں۔ نہ معلوم کب یہ ساری عمارت بیٹھ جائے۔ اس کی بقا کی صرف ایک صورت ہے وہ یہ کہ عورتوں

اور مردوں کے آزادانہ میل جول پہ پابندی لگائی جائے۔ اور عورتوں کو گھروں میں واپس لایا جائے" اسی لیے مغرب میں (BACK TO HOME) کی باقاعدہ تحریک چل نکلی ہے۔

آج کے دور میں مسلمان ماں کو ہمہ جہتی کردار ادا کرنا ہے۔ معاشرہ میں طرح طرح کے بگاڑ پیدا ہو چکے ہیں۔ جو مسلمانوں کو اسلام سے دور لے جارہے ہیں۔ اب بھی اگر عورت سنبھل جائے، وہ مخلص مومن عورت بن جائے، اپنے گھروں میں وقار سے ٹِک جائے، مادیت پرستی کے بجائے اللہ ورسول کی محبت، دینی تربیت اور شعائر اسلام کی پابندی کرے تو یہی آج کے مسلمان معاشروں کی ابتری کا مستقل اور پائیدار حل ہے۔ آج کی نوجوان مسلمان نسل جن مختلف زہروں سے ہلاک ہو رہی ہے وہ درج ذیل ہیں۔

ماحول میں پھیلائے جانے والے زہر فحاشی، ریڈیو، ٹی وی، وی سی آر کی فحش ویڈیو فلمیں آئے دن ریڈیو شاپس میں اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ زہر نوجوان نسل کو کھائے جارہا ہے۔ ٹی وی گھر میں استاد لیکچرر بنا بیٹھا ہے۔ اور گھر کے تمام چھوٹے بڑے بچے بوڑھے، مرد عورتیں اس سے باقاعدہ فحاشی کا درس لے رہے ہیں۔

۲۔ مخرب اخلاق لٹریچر، فحش ڈائجسٹ، گندی اور بے حیا تصویریں جو سیلاب کی طرح ملک کے طول وعرض میں پھیل چکے ہیں۔

۳۔ منشیات — ہیروئن نے اور منشیات کی کثرت نے نوجوان نسل کا حلیہ بگاڑ دیا ہے۔

۴۔ کھیلیں۔ تمام اسلامی ممالک میں نوجوان نسل کو باقاعدہ سازش کے تحت کھیلوں پہ لگا کر قوم کی صلاحیتیں اور وقت اور پیسہ برباد کیے جارہے ہیں۔ سنجیدگی اور متانت نوجوان نسل سے رخصت ہو چکی ہے۔ جذبۂ جہاد اور شوقِ شہادت بیدار کرنے والی مائیں اب خود گانوں اور کرکٹ کے چسکوں میں محو ہو چکی ہیں۔

۵۔ غنڈہ گردی اور تشدد وبا کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ حقوق کے مطالبوں کے لیے تشدد ہوتا ہے۔ ہڑتالیں ہوتی ہیں۔ تعلیمی ادارے اسلحہ خانے بن چکے ہیں، مگر

اپنے فرائض ادا کرنے کی بات کوئی نہیں کرتا۔

۶۔ لڑکیوں کو بیوٹی پارلر، فیشن کا زہر، سلمنگ سنٹر اور مختلف بوتیکس، فیشن شوز، ورائٹی شوز اور مینا بازاروں کے پیچھے لگا دیا گیا ہے۔

یہ سب زہر ماں کے لیے چیلنج ہیں۔ کیا آج کی ماں اس چیلنج کو قبول کرتی ہے، ان سب زہروں کا تریاق ایک ہی ہے۔ اور وہ ہے دینِ اسلام کی طرف واپسی، کہ عورت قرنِ اوّل کی طرح اپنے بھرپور کردار کا مظاہرہ کرے اور جدید اسلامی سوسائٹی کو از سرِ نو اسلام کی بنیادوں پر استوار کر دے۔ اور اگر انہوں نے وقت کی پکار کو نہ سنا تو روزِ قیامت یہی اولاد خدا کے حضور ان کے خلاف فریاد کرے گی ــ اور اللہ تعالیٰ انصاف چاہے گی۔ وَمَا عَلَيْنَا إِلَّا الْبَلَاغُ۔

تہذیبِ مغرب کی مرمریں سلیں

جناب منیر احمد خلیلی صاحب

تہذیب اور کلچر بہت موٹی موٹی تھیوری اور ادق نظریات اور پیچیدہ افکار سے نہیں تشکیل پاتے۔ اِن کا خمیر معاشرے کے افراد کے چھوٹے بڑے اعمال و افعال، رویّوں اور معمولات و عادات سے اُٹھتا ہے۔ کھانا پینا، اوڑھنا بچھونا، ملنا جُلنا، اُٹھنا بیٹھنا، رہنا سہنا، یہ سب اس میں شامل ہوتا ہے۔ حرکات و سکنات اس کا جزو بنتی ہیں۔ سفر و حضر اس کی گرفت میں آتا ہے۔ جلوت ہی نہیں خلوت بھی اس کے زیرِ اثر ہوتی ہے۔ اندازِ نشست و برخاست پر اس کی چھاپ ہوتی ہے۔ تہذیب اِن سب کی مٹی گوندھ کر بنتی ہے۔ البتہ ایک چیز تہذیبی تشکیل میں بنیادی اور اہم ترین عنصر کے طور پر کارفرما ہوتی ہے۔ وہ ہیں کسی معاشرے کے مخصوص عقائد اور ایمانی تصورات۔ تمام تہذیبی اجزا کے معانی و مفاہیم اِن اعتقادی اور ایمانی تصورات کے تابع ہوتے ہیں۔ تہذیب کے اجزائے ترکیبی کی اہمیت میں کمی بیشی کا پیمانہ یہی عقائد و تصورات بنتے ہیں۔ مثال کے طور پر کھانے سے پہلے ہاتھ دھوتے وقت ایک غیر مُسلم کے ذہن میں محض یہ تصور ہوتا ہے کہ ہاتھوں کی آلودگی میں مہلک اور ضرر رساں جراثیم شامل ہو سکتے ہیں اور ہاتھ دھوئے بغیر کھانے سے وہ جراثیم معدے میں چلے جائیں گے اور کھانا کھانے والا بیمار پڑ سکتا ہے۔ اس کے مقابلے میں ایک خدا پرست مسلمان کھانے کی طرف ہاتھ بڑھانے سے پہلے ہاتھ دھونے کی اس لیے فکر کرے گا کیونکہ یہ سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم

ہے۔ ہاتھ دھونے سے صفائی اور جراثیم سے نجات کا مقصد تو حل ہو ہی جائے گا۔ اتباعِ سنّت سے خوشنودیٔ رب کا حصول بھی ممکن ہو جائے گا۔ یہاں مُسلم اور غیر مُسلم کے ایک ہی عمل میں غایت کے مرکزی نکتے میں بنیادی فرق سامنے آگیا ہے۔ یہی فرق دونوں کی تہذیبوں میں بھی مابہ الامتیاز کا درجہ پائے گا۔ ایک غیر مُسلم کسی سے ملتے وقت صبح یا شب بخیر یا نمستے یا نمسکار کہہ کر ملے گا تو مقصد یہ ہوگا کہ اُس کی ملنساریٔ خوش اخلاقی اور تواضع کا ثبوت بہم پہنچ جائے، لیکن ایک مسلمان اپنے مسلمان بھائی کو جب سلام کرتا ہے تو اِس چھوٹے لیکن بڑے ہی خوب صورت جملے کی پُشت پر حُصولِ جنّت کی طلب اور ایمان کی تکمیل ہونی لازمی ہے۔ کیونکہ اس کے سامنے نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہوتا ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ نے روایت ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا: تم جنت میں نہیں جا سکتے جب تک صاحبِ ایمان نہ بن جاؤ۔ اور تم مومن نہیں بن سکتے جب تک کہ تم باہم محبّت نہ کرو۔ اور کیا میں تمہیں ایک ایسی بات نہ بتاؤں جس پر عمل کرو تو تم میں باہمی محبّت پیدا ہو جائے ۔ وہ عمل یہ ہے کہ آپس میں سلام کو عام کرو" (مُسلم) باہم میل جول، محبّت بھرا تعلّق اور حُسنِ معاملہ معاشرتی ضرورتوں میں سے ہے۔ کوئی معاشرہ ان اعمال اور رویّوں سے خالی نہیں۔ لیکن وہاں تعلّق داری اور محبّت و نفرت کا معیار ذاتی اغراض و مفادات ہوتے ہیں کر بھلا ہو بھلا کا فلسفہ کارفرما ہوتا ہے۔ مسلمان معاشرے میں کسی سے بھلائی کرنے اور قریبی اور پُرمحبّت تعلّق رکھنے کی پشت پر اگر للّٰہیت کی رُوح نہ ہو تو اِن اعمال، رویّوں اور تعلقات کی اہمیّت خاک میں مل جاتی ہے۔ مُسلم معاشرے میں روابط و تعلقات کی اساس یہ ارشادِ نبوی بنتا ہے:

اَلْمُوَالَاۃُ فِی اللّٰہِ وَالْحُبُّ فِی اللّٰہِ وَالْبُغْضُ فِی اللّٰہِ

یعنی اللہ کے لیے دوستی، اللہ کے لیے محبّت اور اللہ کے لیے نفرت۔

عطا و نوازش سے کوئی معاشرہ عاری نہیں۔ ضرورت مند عزیزوں، پڑوسیوں اور ہم وطنوں کے لیے ایثار کیا جاتا ہے، لیکن کسی کو نوازتے وقت کہیں اپنی حاتم صفت شخصیت منوانا

مطلوب ہوتا ہے، کہیں ووٹ لینے اور کسی نوع کے تعاون کی جستجو کارفرما ہوتی ہے۔ کہیں انکم ٹیکس سے چھوٹ کے لیے خیرات کو ذریعہ بنایا جاتا ہے، کہیں تمغۂ خدمت کا حصول مقصود ہوتا ہے، لیکن اسلام نے اس عطا و نوازش کو تکمیلِ ایمان کا ذریعہ اور رب کو راضی کرنے کا راستہ بنا دیا۔ "جو شخص اللہ کے لیے دے اور اللہ ہی کے حکم اور منشا کے مطابق دے وہ گویا اپنا ایمان مکمل کر لیتا ہے۔" (ابوداؤد)

اِن ساری مثالوں سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ اسلامی تہذیب میں اعمال اور رویوں کی ایجابی و سلبی قدر و قیمت کا تعین دوسری بے خدا تہذیبوں کے مقابلے میں یکسر جُدا نقطۂ نظر سے کیا جاتا ہے۔ یہاں حقیر سے حقیر عمل بڑے بڑے مثبت یا منفی نتائج کا حامل ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اپنے پیروکاروں کو یہ ہدایت دی ہے کہ نہ تو کسی نیکی کو حقیر جانو خواہ وہ کتنی ہی چھوٹی ہو، نہ ہی کسی بُرائی کو معمولی سمجھو خواہ درجے میں وہ صغائر کی فہرست میں سب سے نیچے ہو۔ قرآنِ پاک میں ہے:

فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ۝ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ ۝ (زلزال - ۸)

یعنی ذرہ برابر نیکی اور ذرہ برابر بدی یوم حساب نظر انداز نہیں رہے گی، سب انسان کے سامنے آجائے گی۔ یہاں تک کہ بعض اعمال انسان سے سرزد ہوتے ہیں تو وہ اس کی نظر میں اتنی اہمیت کے قابل بھی نہیں ہوتے کہ اگلے لمحے تک انھیں ذہن میں رکھے۔ قیامت کے روز وہ اپنے حساب میں یہ باریک شماری دیکھ کر حیران رہ جائے گا کہ اُس کے نامۂ اعمال میں ایسی نیکیاں اور ایسے گناہ محفوظ ہیں جنھیں خود اُس نے دُنیا میں پرِکاہ اہمیت نہیں دی تھی۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اِسی بنا پر اپنے اعمال پر خود کڑے محاسب اور نُکتہ رَس داروغہ کی مانند خوردہ گیر رہتے تھے۔ یوم حساب کے ڈر سے اپنے اعمال کا خود حساب کتاب کرتے رہتے تھے۔ اور اپنے نمبر لگاتے وقت انتہائی سخت ممتحن کا

انداز اختیار کرتے تھے۔ ہم آج جن باتوں اور حرکتوں کو معمولی جان کر بے دھڑک زبان اور ہاتھ پاؤں سے صادر کر دیتے ہیں۔ وہ اس طرح کی باتوں کو زبان سے نکالنے اور ایسے رویّے کے تصور سے کانپ اُٹھتے تھے، چنانچہ حضرت انسؓ بتاتے ہیں اور یہ بخاری کی روایت ہے :

"تم لوگ بہت سے اعمال ایسے کرتے ہو کہ تمہارے نزدیک وہ بال سے بھی زیادہ باریک اور ہلکے ہیں، ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں ان کو مہلکات (تباہ کر دینے والے اعمال) میں شمار کرتے تھے۔"

آئندہ سطور میں ہم چند ایسی چیزوں کا مختصراً ذکر کرتے ہیں جو بظاہر معمولی نظر آتی ہیں۔ ان کے ترک و اختیار کے وقت انسان کے احساس کو کوئی سخت جھٹکا نہیں لگتا۔ بعض کے بارے میں ہلکی سی چبھن بھی نہیں ہوتی، لیکن ان سب کا ہمارے اعتقادات اور ہماری تہذیبی روایات کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ جب ایک سنت ہاتھ سے چھوٹتی اور عمل سے خارج ہوتی ہے تو اُس کی جگہ خالی نہیں رہتی، بلکہ کوئی بدعت اُس خلاء کو پُر کر دیتی ہے۔ ہم اپنی معاشرت کی پہچان رکھنے والے کسی عمل کو ترک کرتے ہیں تو مغربی یا ہندوانہ تہذیب کی کوئی رسم یا روایت ہمارے تہذیبی تسلسل میں داخل ہو جاتی ہے :

ا۔ دوپٹہ بظاہر دو گز کپڑا ہے، لیکن یہ ہماری تہذیب میں عقیدے کی قوت سے داخل ہو کر عورت کی نسوانیت، وقار، شرف و عزت، شرم و حیا، نیکی و شرافت اور خاندانی عظمت پر دلالت کرتا ہے۔ چہرہ نہیں تو کم از کم سر ہی اچھی طرح ڈھانپ کر رکھنے والی عورت کے بارے میں اوّلین تاثر اُس تاثر سے بالکل مختلف ہوتا ہے جو کسی بے حجاب اور ننگے سر والی عورت کو دیکھ کر اُبھرتا ہے۔ دوپٹہ کھو جائے تو نسوانیت گم ہونے لگتی ہے۔ یہ ایک ایسی اینٹ ہے جو دیگر بہت سی اینٹوں کے لیے سہارا بنتی ہے۔ یہ اپنی جگہ سے کھسک جائے تو آہستہ آہستہ وہ ساری اینٹیں بکھرنے لگتی ہیں، جن کے لیے یہ پہلی اینٹ سہارے کا کام دے رہی تھی۔ اولاد کی تربیت، دینی اقدار کا احترام، خوفِ خدا، پاسِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم، فکرِ آخرت، ازدواجی

ڈھانچے اور خاندانی تعلقات، غرض سب پر اثرات پڑتے ہیں اور ایک کنبے اور خاندان کی شناخت کے پیمانے بدل جاتے ہیں۔

۲ــــ لیٹرین اور غسل خانہ کی یک جائی بظاہر بہت چھوٹی سی بات ہے۔ اس میں کئی فائدے بھی مضمر ہیں۔ بچت اور کفایت کا ذریعہ ہے۔ کم محنت اور کم جگہ میں ضرورت پوری ہوسکتی ہے، لیکن اسلامی کلچر میں غسل خانہ اپنا ایک جُدا تصور رکھتا ہے، جس کے ساتھ پاخانے کو جمع نہیں کیا جاسکتا، لیکن آج کل یہ رواج چل نکلا ہے کہ غسل خانہ اور لیٹرین ایک ہی کمرے میں ساتھ ساتھ بنتے ہیں۔ بہت سے انتہائی دیندار گھرانوں میں بھی اس رواج کو اپنا لیا گیا ہے۔ پھر لیٹرین میں رفع حاجت کے لیے بنی ہوئی مخصوص جگہ کا رُخ اگر اس طرح ہو کہ بیٹھتے ہوئے رُخ یا پیٹھ کعبہ شریف کی طرف ہو رہی ہو تو اس چھوٹی سی بات کا خیال نہ رکھنے سے نہ معلوم کتنے دینی احساسات مُردہ ہوجاتے ہیں۔ بے حسی کی یہ کیفیت اگر گہری ہونے لگے اور بعض بُرائیوں کو معمولی سمجھ کر قبول کرنے کی روش چل پڑے تو انسان کا نفس اُسے بڑی بُرائیوں پر ابھارنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔

۳ــــ مردانہ پتلون بظاہر ایسا لباس ہے جسے آج بڑی حد تک باوقار، شائستہ، پُررعب اور اعلیٰ و جدید تعلیم یافتگی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ ہم اس کے غیر اسلامی ہونے پر نہ خود اصرار کرتے ہیں، نہ اس پر کسی کو قائل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ شرفا اور بڑے بڑے سکالر اور صاحبانِ علم بھی پتلون پہن رہے ہیں، تاہم ایک پہلو بہر حال ناقابل انکار ہے کہ پتلون کی ساخت اور تراش خراش سے مغرب کے تہذیبی رویوں کا گہرا تعلق ہے۔ وہاں کھڑے کھڑے پیشاب کرنا قطعاً معیوب نہیں ہے۔ پتلون پوش عموماً پیشاب کے دوران میں وہ سہولت نہیں رکھتے جو دھوتی لنگوٹے یا شلوار پہننے والوں کو میسر ہوتی ہے، چنانچہ پتلون کے کلچر کی مناسبت سے ہر کہیں پتلون پوشوں کے لیے یہ رعایت رکھی جاتی ہے کہ انھیں پیشاب کرنے میں دِقت نہ ہو۔ ہوٹلوں، کلبوں، ہوائی اڈوں، بس سٹاپوں، ریلوے اسٹیشنوں، سرکاری دفتروں

ہیں جو حمام بنے ہوتے ہیں وہاں پتلون پہننے والوں کے لیے دیواروں کے ساتھ ایسے پاٹ لگے ہوتے ہیں جہاں وہ کھڑے کھڑے آسانی سے پیشاب کر سکیں۔ کھڑے ہو کر پیشاب کرنے میں کتنی قباحتیں ہیں یہ شائستگی کے منافی ہے، غیر سنجیدہ حرکت ہے۔ اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے۔ طہارت اور پاکیزگی برقرار رکھنے میں مانع ہے لیکن جو لوگ محض لباس کی مجبوری کے باعث اس قبیح انداز کو اختیار کرتے ہیں، وہ آہستہ آہستہ اسے عادت بنا لیتے ہیں۔ ایسی عادات تہذیبِ اغیار کا تابع بنا کر انہیں اپنی دینی تعلیمات اور روایات سے کاٹ دیتی ہیں۔

۴۔ فرشی دسترخوانوں کی روایت گھٹتے گھٹتے اب بالکل ختم ہو گئی ہے۔ اس کی جگہ ڈائننگ ٹیبل نے لے لی ہے۔ اب تکلفات بڑھے، دعوتوں میں شرکا کی تعداد اور انداز بدلے۔ مہمانوں کو بٹھا کر کھلانا مشکل سے زیادہ جانا نہ عمل نظر آنے لگا۔ اب دعوتیں خواہ کسی نوعیت کی بھی ہوں ان میں بڑی مضحکہ خیز سی صورت پیدا ہوتی ہے۔ کھڑے ہو کر کھانا مجبوری اور فیشن بن گیا ہے۔ میزبان مہمانوں کی بڑی تعداد کو ترتیب سے بٹھا کر ایک ایک کے آگے پلیٹ رکھنے اور ایک ایک کو کھانا پہنچانے کے جھنجھٹ سے چھوٹ گئے۔ بس ایک جگہ پلیٹیں ڈھیر کر دیں، سٹینڈوں پر رکھی بالٹیوں میں سالن، چاول ڈال دیئے۔ جس کی ہمت ہے جو چاہے جھپٹ کر اُٹھا لے۔ جو بڑھ کر تھام لے مینا اُسی کا ہے، والی بات۔ ایک رُخ پہ روسٹ مرغیاں ادھ چبی لٹکی جا رہی ہوتی ہیں اور دوسری طرف کچھ محتاط دست شرفا شڑپ شڑپ شوربا پی کر ہی اپنے آپ کو کوس رہے ہوتے ہیں۔ "مل کر کھاؤ، اپنے سامنے سے کھاؤ، چبا چبا کر کھاؤ، کھانے میں دوسروں کا خیال رکھو، جو اپنے لیے پسند کرو وہی دوسروں کے لیے بھی پسند کرو" جیسی تعلیمات کی مٹی جتنی ان دعوتوں میں پلید ہوتی ہے، شاید ہی کہیں اور ہوتی ہو۔ ان دعوتوں کے مواقع پر آج کل خلافِ سنت اطوار مجموعی طور پر بہت زیادہ اختیار کیے جاتے ہیں۔ تکلفات، نمود و نمائش، فیشن زدگی اور دیکھا دیکھی عمل جمع ہو کر ایسی فضا پیدا کرتے ہیں کہ جو لوگ مسنون اور معقول طریقے سے

ان دعوتوں میں کھانے پینے کے خواہش مند ہوتے بھی ہیں وہ مجبوراً اپنی تہذیب اور اپنے دین کی روایات سے متضاد ماحول میں ایسا کر نہیں پاتے۔

۵۔ جلدی سونا اور جلدی جاگنا سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ یہ صحت کے لیے مفید اور فطرت کے قریب عمل ہے۔ انسان کی طبیعت خوش باش اور قوتِ کار بحال رہتی ہے۔ مزاج خوش گوار رہتا ہے۔ راتوں کو جاگنا اور دیر تک جاگنا کسی دور میں لوفر لفنگوں، چور اچکوں، درندوں اور موذی جانوروں کا معمول سمجھا جاتا تھا، لیکن آہستہ آہستہ مغربی طور اطوار کا رنگ ہم پر چڑھنے لگا۔ اہلِ مغرب ہوٹلوں، کلبوں اور شراب خانوں میں دادِ عیش و طرب دینے اور لہو و لعب میں ڈوبے رہنے کے لیے رات کے پہلے پہروں ہی کو استعمال کرتے ہیں۔ صبح دیر تک سونا ایسے لوگوں کی مجبوری اور پھر عادت ہو جاتی ہے۔ ہمارے ہاں ٹیلی ویژن کی آمد نے شب بیداری کا سامان پیدا کیا۔ اب بہت کم گھرانے ایسے ہیں جہاں دیر تک جاگنا اور دیر سے جاگنا معمول نہ ہو۔ گویا اس پہلو سے بھی ہم نے فرنگی تہذیب سے مطابقت پیدا کر لی ہے۔

۶۔ کرکٹ کا کھیل ہماری قوم کا جنون اور دیوانگی کی حد تک بڑھا ہوا شوق بن گیا ہے۔ اس وائرس نے پھیل کر قوم کی تمام رگوں میں اپنا زہر پھیلا دیا ہے۔ اس پر تفصیل سے اور بہت زیادہ لکھنے کی ضرورت ہے۔ یہاں ہم اختصاراً چند پہلوؤں کی نشاندہی پر اکتفا کریں گے۔ یہ کھیل بنیادی طور پر تمام کا تمام ہمارے تہذیبی رویوں سے متصادم ہے۔ اس کے اندر وہ مارشل سپرٹ نہیں ہے جو بعض کھیلوں کا خاصا ہے۔ تضیعِ اوقات، سہل انگاری، بے فکری، مہنگا پن اس کھیل کی بنیادی خصوصیات میں سے ہیں۔ قوم کو کچھ نہ دے کر یہ قوم کے اندر سے قوتِ کار، عاقبت و انجام اندیشی اور محنت و جفاکشی کے جذبے سلب کر رہا ہے۔ مزاج کے اعتبار سے اس کی مناسبتوں کا اندازہ اس امر سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ فلمی اداکاراؤں اور کرکٹروں میں کوئی ایسی خفیہ قدر مشترک ہے کہ ہمارے بعض کرکٹروں کی شادیاں فلمی ایکٹریسوں سے ہو چکی ہیں۔ کئی ایک کے باہمی ناپسندیدہ روابط کے قصے اخبارات کی زینت

بنتے رہتے ہیں۔ کرکٹ کو آج عمدہ ذوق کی علامت سمجھ لیا گیا ہے۔ حالیہ ایک روزہ میچوں کے دوران میں ایک مقام پر ایک خاندان کے بہت سے افراد جمع تھے۔ دیندار گھرانہ پردہ دار دوشیزائیں، لیکن کرکٹ کی بیماری کا اثر ان پر بھی دیکھا۔ ایک محترمہ پوچھتی ہیں: "آج کے میچ کا کیا بنا؟" سب نے کچھ تاسف بھرے لہجے میں بتایا کہ وہ خبریں نہیں سن سکے۔ اس پر ان دیندار اور برقعہ پوش اور طالبات کی ایک دینی تنظیم سے وابستہ طالبہ نے تبصرہ فرمایا "کیا تم سب اتنے بے ذوق ہو کہ کسی کو میچ کے رزلٹ کی کوئی خبر نہیں"! اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کرکٹ کا روگ کیسی کیسی رگوں میں سرایت کر گیا ہے۔

ایک اور قابل توجہ پہلو یہ ہے کہ ملتِ اسلامیہ کے بڑے دشمن اور بدخواہ ممالک میں سے کرکٹ کا کھیل روس میں ہے نہ امریکہ میں اور نہ اسرائیل میں۔ یہ انگریزوں کی عنایت ہم ذہنی غلاموں پر ہوئی اور ہم نے بڑی ممنونیت سے اس عنایت کو اپنی تہذیبی روایت بنا لیا ہے۔

بحث و نظر

اِنسدادِ منکرات ـــــ ایک وضاحت

جناب محمد نواز صاحب - رحیم یار خان

ترجمان القرآن (جنوری) میں جناب نور الٰہی ایڈووکیٹ نے میرے اس مضمون پر، جو امر بالمعروف و نہی عن المنکر سے متعلق تھا، گرفت فرمائی ہے۔ اس لیے میں ان کا شکر گزار ہوں، کیونکہ ان کی وجہ سے مجھے اس موضوع پر مزید غور و فکر کرنے کا موقع آ گیا ہے۔

چند باتیں وضاحتاً عرض کیے دیتا ہوں امید ہے کہ ان سے جناب نور الٰہی صاحب کی غلط فہمی دُور ہو جائے گی:

۱۔ قرآنِ حکیم کی کسی آیت کا انسانی زبان میں ترجمہ کرنے سے یہ بات لازم نہیں آتی کہ اس ترجمہ کو سو فی صد منشائے الٰہی کے مطابق قرار دیا جائے۔ یا وہ ترجمہ آیت کے پورے مفہوم پر حاوی ہے۔ اس معاملہ میں خواہ کتنی ہی احتیاط کیوں نہ برتی جائے اصل اور ترجمہ میں فرق بہر حال موجود رہے گا۔ لہٰذا اگر کسی آیت کے ترجمہ کے بارے میں یہ کہا جائے کہ وہ متعلقہ آیت کے پورے مفہوم پر حاوی نہیں تو یہ بات کچھ زیادہ قابلِ اعتراض نہیں ہونی چاہیے۔

قرآن مجید کے تراجم و تفاسیر کا جو ذخیرہ اردو زبان میں موجود ہے، اس میں تراجم کے اختلاف سے انکار ممکن نہیں۔ اگر صرف سورۃ بقرہ کی آیت .... اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ ...... کے مختلف ترجموں کا موازنہ کیا جائے تو حقیقتِ حال خود بخود منکشف ہو جائے گی۔

۲ ـــ تراجم کا یہ اختلاف " امر بالمعروف و نہی عن المنکر" کے بارے میں بھی موجود ہے

سورۂ آل عمران کی آیت ..... وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ .....
(الآیۃ ۱۰۴) کے مختلف ترجمے ملاحظہ ہوں :

۱۔ " اور چاہیے کہ ہو تم میں سے ایک جماعت بلاویں طرف بھلائی کے اور حکم کریں ساتھ اچھی چیز کے اور منع کریں نامعقول سے اور یہ وہی ہیں چھٹکارا پانے والے " (شاہ رفیع الدینؒ)

۲۔ " اور چاہیے کہ رہیں تم میں، ایک جماعت بلاتے نیک کام پر اور حکم کرتے پسند بات پر اور منع کرتے ناپسند کو اور وہی پہنچے مراد کو "

(شاہ عبدالقادرؒ)

۳۔ " اور چاہیے کہ تم میں ایک جماعت ہو، جو نیک کام کی طرف بلاتی رہے اور اچھے کام کا حکم کرتی رہے اور برے کاموں سے روکتی رہے ..."

(مولانا احمد علی لاہوری)

۴۔ " اور چاہیے کہ رہے تم میں ایک جماعت جو بلاتی رہے نیک کاموں کی طرف اور حکم کرتی رہے اچھے کاموں کا اور منع کرتی رہے برائی سے اور وہی پہنچے مراد کو " (شیخ الہندؒ)

۵۔ " اور چاہیے کہ رہے تم میں ایک جماعت ایسی جو بلاتی رہے نیک کام کی طرف اور حکم کرتی رہے اچھے کام کا اور منع کرتی رہے برائی سے "

(مولانا مفتی محمد شفیعؒ)

۶۔ " اور چاہیے کہ تم میں ایک گروہ رہے جو نیکی کی دعوت دے، معروف کا حکم کرے اور منکر سے روکے " (مولانا امین احسن اصلاحی)

۷۔ " تم میں کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہونے چاہئیں جو نیکی کی طرف بلائیں بھلائی کا حکم دیں اور برائیوں سے روکتے رہیں " (سید مودودیؒ)

راقم الحروف کو اپنی علمی بے مائیگی کا اعتراف ہے، مگر اس کے باوجود بصد ادب و احترام یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ ان میں سے کوئی ترجمہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

کے جامع مفہوم پر حاوی نہیں ۔ اگر ایک بزرگ نے معروف کا ترجمہ "اچھی چیز" کیا ہے تو دوسرے نے "پسند بات" لکھا ہے ۔ اگر کوئی معروف کو "اچھے کاموں کے معنی میں استعمال کرتا ہے تو دوسرے کے نزدیک "نیک کام" ہے ۔ کسی نے اس کا ترجمہ صیغہ "واحد" میں کیا ہے تو کسی نے "جمع" میں ۔ صاحب تفسیر قادری نے " یَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ...... (آل عمران - ۱۱۴) کی ترجمانی ان الفاظ میں کی ہے :

" حکم کرتے ہیں خلق کو تصدیق محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ، ساتھ امورات شرع کے اور منع کرتے ہیں تکذیب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے یا تمام نہیات سے "

" معروف " قرآن مجید کی بڑی اہم اصطلاح ہے ۔ اس کا تعلق دین کے بنیادی فرائض سے ہے ، مگر ان مختلف ترجموں میں (...... بصد معذرت) اسے قرآن کی مخصوص اصطلاح نہیں رہنے دیا گیا ۔ اسے عام لفظ سمجھ کر لغت کی مدد سے اس کا ترجمہ کیا گیا ہے ۔ جس کی وجہ سے معروف کا جامع مفہوم نکھر کر سامنے نہیں آتا ۔ یہ بات بھی واضح نہیں ہوئی کہ آیا معروف محض " نیکی " اور " بھلائی " کا نام ہے یا نیکیوں کے مجموعہ کو " معروف " کہتے ہیں ، اور یا پھر اس سے مراد وہ " المعروف " ہے جو ساری نیکیوں کا منبع و مصدر ہے جس سے خیر کے سارے چشمے پھوٹتے ہیں ۔ یہی معاملہ " منکر " کے مفہوم کا بھی ہے آیا اس سے کوئی خاص منکر یا منکرات کا سارا کنبہ مراد ہے یا اس سے وہ " المنکر " مراد ہے جو ساری برائیوں اور خرابیوں کی بنیاد ہے ۔

اس بارے میں لغت ہماری مدد نہیں کرتی اور تراجم بھی اس کا جامع مفہوم بیان کرنے سے عاجز ہیں ۔ لہٰذا اس کا جامع مفہوم سمجھنے کے لیے حضور صلی اللہ علیہ کی سیرت طیبہ اور سنت مطہرہ کی طرف رجوع کرنا پڑے گا ۔ کیونکہ قرآن اپنی مخصوص اصطلاحات کی یا تو خود تشریح کرتا ہے یا پھر اس کی اصطلاح کے مفہوم کو صرف سنت و سیرت یا جماعت صحابہؓ کے اجتماعی عمل سے سمجھا جا سکتا ہے ۔ قرآن کی مخصوص اصطلاحات کی تشریح کے

لیے محض عربی لغت پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا - قرآنی اصطلاحات کی تفہیم کے لیے اصل ڈکشنری یا لغات صرف اور صرف سنّت ہی ہے - سنّت ہی سے "معروف"، "منکر" اور "اُمّت" جیسے الفاظ کے معنی معلوم ہوں گے - اور سنّت ہی سے "اقامتِ صلوٰۃ"، "فعلِ زکوٰۃ"، "بِر" اور "تقویٰ" جیسی اصطلاحات کی تشریح ہوتی ہے - ان اصطلاحات کا نہ تو کلامِ عرب سے کوئی تعلق ہے کہ ان کے سمجھنے کے لیے اس سے نظائر تلاش کی جائیں - اور نہ زبان و ادب کی باریکیوں اور لطافتوں میں جانے کی ضرورت ہے - لہٰذا مذکورہ بالا آیت کا جامع مفہوم وہی مستند ہوگا جس کی تائید حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّتِ طیبہ سے ہوگی -

۳ - تفہیم القرآن کی "فہرست موضوعات" دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں سات آیات ایسی ہیں جن میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا ذکر ہوا ہے - تین آیات سورۂ آل عمران میں ہیں (۱۰۴ - ۱۱۰ - ۱۱۴) ایک آیت (۱۹۹) سورۂ الاعراف میں، ایک سورۂ توبہ (۷۱) میں، ایک سورۂ الحج میں (۴۱) اور ایک سورۂ لقمان (۱۷) - ان میں صرف سورۂ الاعراف اور سورۂ لقمان کی آیات مکّی ہیں، باقی ساری آیات مدنی ہیں - مکّی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مکّہ ہی میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فریضہ پر عمل کرنے کی ہدایت دی گئی تھی، سورۂ اعراف میں یہ ہدایت ان الفاظ میں موجود ہے :

"درگذر کرو، نیکی (معروف) کا حکم دو اور جاہلوں سے اعراض کرو۔"
(تدبّر قرآن)

سورۂ لقمان میں اللہ تعالیٰ نے واضح فرما دیا تھا کہ یہ فریضہ معمولی نوعیت کا نہیں، بلکہ بڑا اہم ہے - اس راہ میں مصائب کو صبر کے ساتھ برداشت کرنا ہوگا - یہ عزم الامور میں سے ہے اور "یہ بڑے حوصلہ کا کام ہے، اصلاحِ خلق کے لیے اٹھنا اور اس کی مشکلات انگیز کرنا، کم ہمت لوگوں کے بس کی بات نہیں - یہ ان کاموں میں سے ہے جن کے لیے بڑا دل گردہ چاہیے۔" (تفہیم القرآن ۴، حاشیہ - ۳۰)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مکی دور کا افتتاح اس دعوت سے فرمایا:

"اے لوگو! کہہ دو کہ سوائے اللہ کے کوئی معبود نہیں تو کامیاب ہو جاؤ گے، عرب کے حکمران بن جاؤ گے۔ عجم تمہارے ماتحت ہو جائیں گے اور جب تم ایمان لے آؤ گے تو جنت میں بھی بادشاہ بن جاؤ گے [۱]"

نیکی اور بھلائی کے اور بھی کئی کام موجود تھے، مگر آپ نے پہلے قدم پر "لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه" کی دعوت دے کر پورے جاہلی نظام کو رد کر دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے معروفات میں سے کسی کی طرف اتنے تسلسل کے ساتھ دعوت نہیں دی، جتنی اس کلمہ کی بالادستی کی دعوت پر اصرار کیا۔ اس سے یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ یہی دعوت ہی سب سے بڑا معروف ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مکی دور کا اختتام دعائے ہجرت پر ہوتا ہے۔ جس میں بڑے معروف کی طلب آپ کی دعا کے اس جملہ میں ڈھل گئی۔ "وَاجْعَلْ لِّيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطَانًا نَّصِيْرًا" ۔ یعنی کسی طاقت کو میرا مددگار بنا دے"۔

یہاں "سلطان" سے مراد بھی یہی "المعروف" یا معروفِ اعظم ہے۔ امام المفسرین ابن جریرؒ نے حسن بصری اور قتادہ کے اس قول کو ترجیح دی ہے کہ اس آیت میں "سلطان" سے مراد "اقتدار، غلبہ اور حکومت ہے [۲]" حافظ ابن کثیرؒ نے بھی یہی تفسیر اختیار کی ہے۔ امام ابن تیمیہؒ [۳] فرماتے ہیں کہ "حکومتِ اسلامیہ دین کا بلند ترین فرض اور واجب ہے۔ بلکہ اس کے بغیر دین قائم ہو ہی نہیں سکتا" حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مطالعہ سیرت سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آپ کی ساری مساعی جمیلہ کا ہدف المعروف یعنی دین کا غلبہ اور اس کی حکومت کا قیام تھا۔

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی حکومت مدینہ

[۱-۲-۳] ۔ حاشیہ ۔ بحوالہ اسلامی سیاست از مولانا گوہر الرحمٰن ص ۱۶۹ - ۱۱۲ - ۱۳۸ -

میں قائم فرمائی تھی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ کلمہ کی حکومت کے قیام کا اعلان آپ کی بعثت ہی کے ساتھ ہو گیا تھا۔ نبی جب مبعوث ہوتا ہے تو اس کی بعثت کی حیثیت موجود الوقت نظام کے مقابلے میں ایک الگ نظام، اور موجود الوقت ریاست وحکومت کے متوازی اور اس کے مخالف ایک الگ ریاست وحکومت کی ہوتی ہے۔ مکہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کلمہ طیبہ کی دعوت کے ذریعے اپنی الگ ریاست وحکومت کے قیام کا اعلان فرمایا، اور اپنے وقت کے جاہلی نظام کو رد فرمایا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس ریاست کو صرف خطۂ ارض کی ضرورت تھی، اس مقصد کے لیے آپ نے اہلِ مکہ سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنے جاہلی اقتدار سے دست بردار ہو کر آپ کی اطاعت پر آمادہ ہو جائیں۔ مگر انہوں نے مزاحمت کی، اس بات کو آپؐ نے اہلِ طائف کے سامنے رکھا، وہ بھی مخالف ہو گئے۔ آپؐ نے اس مقصد کے لیے اللہ سے دُعا کی کہ وہ اقتدار کے ذریعے مدد کرے۔ چنانچہ وہ دُعا قبول ہوئی، مدینہ میں آپؐ کو تمکن فی الارض[۱] نصیب ہو گیا۔ جماعتِ صحابہؓ کو "خیر امت[۲]" کا لقب ملا اور بنی اسرائیل کو انسانیت کی امامت کے منصب سے معزول کر کے اس پر امتِ مسلمہ کو فائز کر دیا گیا[۳]۔

یہاں یہ بات خاص طور پر قابلِ توجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو فرائض مکہ کی نظریاتی ریاست کے لیے مقرر کیے تھے وہی فرائض تمکن کے بعد مدینہ کی ریاست کے بھی تھے۔ مکہ میں بھی اقامتِ صلوٰۃ، فعلِ زکوٰۃ یعنی تزکیۂ نفوس بذریعہ انفاق، کمزوروں کی مدد اور دعوت الی الخیر اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر پر عمل ضروری تھا۔ اسی طرح مدینہ میں بھی اقامتِ صلوٰۃ، ایتائے زکوٰۃ اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر ریاست و حکومت کے لازمی وظائف قرار دیے گئے۔ گویا "المعروف" مکہ میں بھی تھا، مگر اس کے پاس کوئی خطۂ زمین نہ تھا، اس کے حصول کے لیے کوشش کی گئی، "المعروف" مدینہ میں

---

[۱] الحج - ۴۱
[۲،۳] تفہیم القرآن حاشیہ ۸۸

بھی موجود تھا، یہاں اس کے پاس زمین موجود تھی۔

"المعروف" دراصل عقیدہ و ایمان کی ریاست کا نام ہے، وہ بغیر کسی خطہ ارضی کے آج بھی موجود ہے۔ اس کا اپنا الگ دستور، اپنا الگ نظامِ عبادت و طاعت اپنا نظامِ قانون اور اپنی الگ تہذیب و ثقافت ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس المعروف کو کسی خطۂ زمین پر مکمل —— تمکن حاصل ہو، اس بات کا انحصار اُمّت کی تنظیم، اتحاد اور طاقت پر ہے۔

۵۔ یہاں خود اس اُمّت کی ہیئتِ ترکیبی پر بھی غور کر لینا چاہیے۔ جس پر "المعروف" کے قیام کی ذمہ داری ڈالی گئی ہے۔ اُمّت کلمہ گو افراد کے منتشر، بے امام اور مقہور و مغلوب گروہ کا نام نہیں۔ نہ حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم کے دَور میں مسلمانوں میں کوئی ایسا گروہ پایا جاتا تھا اور نہ کوئی ایسا گروہ نزول قرآن کے وقت سورہ آل عمران کی متعلقہ آیات کا مخاطب تھا۔

"اُمّت" —— دراصل مسلمانوں کے اس گروہ کا نام ہے جس میں امامت، قیادت، خلافت یا امارت کا نظام علیٰ منہاج النبوۃ و علیٰ طریق خلفائے راشدین قائم ہو، اس میں سمع و طاعت کا نظام موجود ہو، وہ متحد ہو، اُسے اقتدار اور حکومت حاصل ہو اور اسے "امر" اور "نہی" کے نفاذ پر قدرت حاصل ہو۔ اگر خدانخواستہ کسی وقت کسی حادثہ کی صورت میں یہ حالت برقرار نہ رہے اور قیادت و امامت کا تسلسل ٹوٹ جائے تو اس صورت میں وہ گروہ "اُمّت" کے لقب کا مستحق ہوگا۔ جو اس میں اتحاد پیدا کرنے اور اس میں امامت یا امارت کی بحالی یا اس کے نظامِ عبادت و اطاعت کے قیام کے لیے مسلسل جدوجہد کرتا رہے گا۔

کیونکہ انتشار اور فساد کی صورت میں دین کے کسی بھی فریضہ، حتیٰ کہ اقامتِ صلوٰۃ، ایتائے زکوٰۃ، امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور حج جیسی عبادات پر سنّت کے مطابق عمل ہو ہی نہیں سکتا۔ دین کا پورا نظام درہم برہم ہو کر رہ جاتا ہے۔ اور توحید اور رسالت جیسے اساسی عقائد کے تقاضے بھی پورے نہیں ہو سکتے۔ انتشار اور فساد کی صورتِ حال

پر مطمئن ہو کر زندگی بسر کرنا عقیدہ و ایمان کی موت کے مترادف ہے۔

دین کے فرائض کی بجا آوری کے لیے اُمت کا اتحاد اور اس کا غالب و حکمران ہونا از بس ضروری ہے۔ اس سلسلے میں سید قطب شہید نے مذکورہ بالا آیت کی تفسیر میں لکھا ہے:

"حقیقت یہ ہے کہ ایک جماعت ناگزیر ہے جو خیر کی دعوت دے، معروف کا حکم کرے اور منکر سے روکے۔ اسی طرح زمین پر اقتدار بھی ناگزیر ہے جو خیر کی دعوت دینے والا ہو، معروف کا حکم کرنے والا اور منکر سے روکنے والا ہو"۔

اگر کسی حادثہ کے باعث اُمت کا شیرازہ منتشر ہو جائے تو پھر دین و ایمان کے بچاؤ کے لیے دو ہی صورتیں باقی رہ جاتی ہیں۔ اور یہ دونوں خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت فرمائی ہیں۔ فرمایا:

"جو لوگ میرے بعد زندہ رہیں گے وہ اُمت میں بہت سارے اختلافات دیکھیں گے۔ ایسے وقت میں تمہارے لیے ضروری ہوگا کہ میری "سنت" اور برسرِ ہدایت خلفائے راشدین کی سنت" کو مضبوطی سے اور دانتوں سے پکڑے رہو" (ابوداؤد)

صاف ظاہر ہے کہ اس حدیث سے "سنت" کا وہ مفہوم مراد نہیں لیا جا سکتا جو عام طور پر معلوم اور مشہور ہے۔ اس سے مراد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی اور مدنی حیاتِ طیبہ کا پورا اسوہ اور عمل ہے۔ اور خلفائے راشدین کی سنت سے بھی ان کے دَورِ اقتدار و حکومت کا اجتماعی عمل مراد ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سنت کی نمایاں خصوصیات یہ تھیں:

۱۔ آپ نے المعروف کے قیام کی دعوت دی، جاہلی نظام کو رد کر دیا، اور وقت کے جاہلی اقتدار سے مطالبہ کیا کہ وہ حضورِ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے تابع ہو جائے۔ المعروف کے تمکن کے لیے خطۂ زمین حاصل کر کے اسے سارے جزیرۃ العرب میں غالب کر دیا۔

۲۔ اُمت کی تنظیم و تربیت کے لیے اقامتِ صلوٰۃ اور فعلِ زکوٰۃ کو رائج فرمایا اور اسے ایک مکمل نظامِ عبادت و اطاعت کے تابع کر دیا۔

۳۔ المعروف کے تمکّن و اقتدار کے بعد آپؐ نے معروفات کو فروغ دیا، جرائم کا انسداد فرمایا، امنِ عامہ کو قائم کیا، اشرار کی سرکوبی کی، "امر" اور "نہی" کو نافذ فرمایا اور اسلامی ریاست کی سرحدوں کے تحفظ، دفاع اور توسیع کے لیے جہاد کیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اس سنّت کے پانچ عنوانات خود ہی قائم فرمائے اور اُمت کے ہر فرد کو حکم دیا کہ وہ ان پانچ باتوں کو اپنے اُوپر لازم ٹھیراتے، فرمایا:

"میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں: جماعتی زندگی، سمع (احکام سُننا)، اطاعت (حکم ماننا)، ہجرت اور جہاد فی سبیل اللہ"۔ (مشکوٰۃ)

حقیقت یہ ہے کہ یہ پانچوں باتیں ہی دراصل آپؐ کی جامع سنّت ہیں۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی باقی تمام سنن اس جامع سنّت کے ساتھ تسبیح کے دانوں کی طرح جُڑی ہوئی ہیں۔

اس ساری گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ:

۱۔ معروف سے مراد المعروف ہے۔ اگر یہ اقتدار کی طاقت سے محروم ہو تو امر بالمعروف کا مطلب اس کے اقتدار کو قائم کرنے کی جدوجہد ہوگی۔ اس صورت میں یہ فریضہ تحریک اقامتِ دین کے مترادف ہوگا۔ سورۂ اعراف (۹۹) اور سورۂ لقمان (۱۷) کی متعلقہ آیات کے نزول کے وقت یہی صورت موجود تھی۔

۲۔ اگر "المعروف" قائم ہو تو پھر امر بالمعروف کا مطلب ہوگا۔ المعروف کے واسطہ و وسیلہ سے "امر" اور "نہی" کا نفاذ۔ اس صورت میں یہ اسلامی حکومت کے ہم معنی ہوگا سورہ آل عمران کی آیات (۱۰۴-۱۱۰) اور سورہ الحج کی آیت (۴۱) کے نزول کے وقت یہی صورت موجود تھی۔

۳۔ اوّل الذکر صورت میں "جماعت" کا ہونا ضروری ہے۔ اور مؤخر الذکر کی صورت میں اس جماعت کے لیے حکومت و اقتدار کا ہونا ناگزیر ہے۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا یہ وہ مفہوم ہے جو قرآن مجید کے مختلف ترجموں[1] سے کما حقہٗ ظاہر نہیں ہوتا۔ راقم الحروف کے ذہن میں اس کے بارے میں اشکال تھا، اُسے دُور کرنے کے لیے راقم الحروف نے وہ ترجمہ بطور تجویز تحریر کیا جس پر جناب نور الٰہی صاحب نے اعتراض کیا ہے۔ راقم کو اپنے اس ترجمے کے جامع ہونے پر قطعی اصرار نہیں اور نہ وہ اس ترجمہ کا دفاع ہی کرے گا۔

رہی یہ بات کہ متعلقہ آیت کے ترجمہ میں "ب" کا استعمال بطور استعانت یا واسطہ وسیلہ کے صحیح ہوا ہے یا غلط۔ اس بحث کا کوئی حاصل نہیں اور نہ اب اس کا موضوعِ زیر بحث سے کچھ زیادہ تعلق باقی رہا ہے۔ اصل قابلِ توجہ بات یہ ہے کہ وہ مفہوم جو ان سطور میں بیان کیا گیا ہے، اگر صحیح ہے تو بحث ختم! ان سطور کا راقم، نہ تو مفسر ہے، نہ مترجم اور نہ ماہر لسانیات، وہ صرف علم صحیح اور فہمِ قرآن کا گداگر ہے اور اہلِ علم کا خوشہ چیں ہے۔ اس سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت نہیں۔

---

[1] واضح رہے کہ یہ ساری گفتگو صرف "ترجموں" تک محدود ہے۔ جہاں تک "امر بالمعروف کی تفسیر" کا تعلق ہے اس سے مکمل اتفاق ہے۔ جیسا کہ شاہ عبد القادرؒ لکھتے ہیں ــ "معلوم ہوا کہ مسلمانوں میں فرض ہے کہ ایک جماعت قائم رہے جہاد کرنے کو اور دین کا تقید رکھنے کو تا خلافِ دین کوئی نہ کرے"۔ اسی طرح آل عمران آیت ۱۱۰ کی تفسیر میں فرماتے ہیں ــ "یعنی یہ اُمت بہتر ہے اسی دو صفت میں امر بالمعروف یعنی جہاد اور ایمان یعنی توحید کا تقید اس قدر اور دین میں نہیں"۔ اردو کے بعض مفسرین نے امر بالمعروف کی تفسیر "جہاد" یا "توحید، رسالت اور معاد" کی دعوت ہی کے معنوں میں کی ہے۔

رسائل ومسائل

خط جناب ڈاکٹر حمید اللہ صاحب۔ پیرس (فرانس)

سوال: آپ کے مؤقر رسالے کی جلد ۱۱۴، عدد ۳، بابت نومبر ۱۹۹۰ء میں، حصۂ رسائل و مسائل میں " ازواجِ مطہرات رضؓ کے متعلق ایک نازک بحث" کے عنوان سے ایک طویل بحث چھپی ہے۔ کسی نے آپ سے پوچھا تھا کہ الدراسات الاسلامیہ دسمبر ۱۹۸۹ء میں میرے چھپے ہوئے مضمون ــــــ "هل خالف النبي عليه الصلوٰة والسلام اوامر الاية: مثنىٰ وثلاث ورُبع؟" پر آپ کی کیا رائے ہے۔ اور اس پر آپ نے تفصیل سے یہ فرمایا ہے کہ آپ کو اس سے اتفاق نہیں ہے۔

ترجمان القرآن میرے علم میں یہاں کہیں نہیں آتا۔ اور میں اس سے بے خبر ہی رہتا اگر کراچی کے ایک دوست مجھے اس کی فوٹو کاپیاں نہ بھیجتے۔ میں اس پر ایک مؤدبانہ جواب لکھ رہا تھا کہ اس اثناء میں الدراسات الاسلامیہ کی جلد ۲۵ عدد ۲ موسم گرما ۱۹۹۰ء میں " ملاحظات حول مقالة الدكتور محمد حميد الله" کے عنوان سے محترم استاذ محمد صغیر حسن معصومی نے میرے خیالات سے اپنی، اور اپنے ادارے کی برأت ظاہر فرمائی ہے۔

اِن حالات میں اگر آپ بحث جاری رکھنے پر آمادہ ہیں تو میں اپنی ناچیز رائے آپ کی خدمت میں ارسال کروں گا کہ الحق يعلو ولا يُعلىٰ عليه

ورنہ میں سکوت اختیار کر لوں گا اور علام الغیوب ہی اس کا فیصلہ کرے گا۔

صرف ایک لفظ ابھی سے عرض کر دوں ؟ میری ۱۹۴۲ء کی مطبوعہ کتاب "رسول اکرمؐ کی سیاسی زندگی" میں مماثل بحث و استدلال کو دیکھ کر آپ تحریر فرماتے ہیں وہ ایک دوسرے کا چربہ ہیں۔ یہ درست ہے مگر اس کے معنی یہ ہیں کہ میں نئی بات دیکھ کر بے سوچے سمجھے اچھل نہیں پڑتا، بلکہ سالہا سال، نصف صدی تک غور بھی جاری رکھتا ہوں اور مزید تلاش بھی۔

جواب خط[1]

محترمی ڈاکٹر صاحب!

آنجناب کا خط ملا۔ آپ کے خیالات کے بارے میں محتاط اور مؤدبانہ اختلافی تحریر جناب ملک غلام علی صاحب نے لکھی جو سابق جسٹس وفاقی عدالت شرعیہ رہ چکے ہیں اور کئی برس مسلسل خصوصی سیکرٹری برائے مسائل و مباحث مولانا مودودیؒ کی خدمت میں مصروف کار رہے ہیں۔

آپ اُن کی رائے کے خلاف اظہار کا پورا پورا حق رکھتے ہیں۔ اور آپ جیسے نامور عالم اور محبِ دین ہستی کی کسی تحریر کا شائع کرنا ہمارے لیے باعثِ اعزاز ہوگا۔ علاوہ ازیں یقین ہے کہ آپ حسنِ اختلاف کا زیادہ بہتر نمونہ پیش فرما کر اُمت کی خدمت کریں گے۔

آنجناب نے مجمع البحوث الاسلامیہ (اسلام آباد) میں شائع شدہ مولانا محمد صغیر حسن معصومی کی جس تحریر کا حوالہ دیا ہے، اُسے آج ہی منگوا کر دیکھا گیا ہے (ملاحظات حول مقالۃ الدکتور محمد حمید اللہ) ــــــ اگرچہ معصومی صاحب اور ملک صاحب دونوں نے علیحدہ علیحدہ طور پر اظہارِ خیال کیا ہے۔ اور کسی پر دوسرے کی کوئی ذمہ داری نہیں آتی، مگر معصومی صاحب کا مقالہ بھی خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ وہ صاحبِ تدبر و اعتدال عالم ہیں اور وہ اپنے دینی مباحث میں راسخ الفکر ہیں۔

بہر حال آپ کے مقالے کا انتظار رہے گا جس کی اشاعت اب اپریل کے شمارے ہی میں ہو سکے گی کیونکہ مارچ کا پرچہ ۲۰ فروری تک پریس کے لیے تیار ہو جائے گا۔ اپریل کا شمارہ بھی ۲۰ مارچ تک تیار ہو جائے گا۔

---

[1] تفصیلی خط الگ لکھا جا رہا ہے۔ (نعیم صدیقی۔ مدیر رسالہ)

مطبوعات

تین دن بغداد میں | مصنف: حکیم محمد سعید - ناشر: نونہال ادب، ہمدرد فاؤنڈیشن کراچی - صفحات: ۸۸ قیمت: -/۱۲ روپے

یہ ایک بہت خوب صورت اور مفید کتاب ہے۔ جو حکیم محمد سعید صاحب نے بچوں کے لیے لکھی ہے۔ جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہوتا ہے انھوں نے اس میں سفر بغداد کے واقعات درج کیے ہیں۔ لیکن ضمناً ایسی بے شمار باتیں لکھ دی ہیں جن سے بچوں کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک کامیاب زندگی بسر کرنے کے لیے کیا کچھ کرنا چاہیے۔ کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے عمدہ اطوار اور بہترین خیالات کے حوالے سے حکیم صاحب کی ایسی پیاری شخصیت ابھرتی ہے کہ بچے اسے اپنے لیے اعلیٰ نمونہ قرار دے سکتے ہیں۔ اپنے دین سے گہری محبت، علم حاصل کرنے اور علم پھیلانے کی لگن، محنت کی عادت اور حب الوطنی وغیرہ ایسی صفات ہیں جن کی وافر جھلکیاں اس مختصر کتاب میں ملتی ہیں۔ انداز بیان آسان اور ایسا خوب صورت ہے کہ خواجہ حسن نظامی کے روزنامچے کی یاد تازہ ہوتی ہے۔

کتاب میں اگر کسی کمی کا احساس ہوا تو وہ یہ ہے کہ اس میں بغداد کے حالات بس برائے وزن بیت ہی ہیں۔ جب کہ ضرورت اس بات کی تھی کہ زیادہ باتیں اس تاریخی شہر اور اس بڑے اسلامی ملک کے بارے میں بتائی جاتیں۔ ص ۳۷ سے ص ۵۳ تک ۱۷ صفحات الٰہ دین کی معروف کہانی کی نذر کر دیے گئے ہیں۔ تاہم اپنی موجودہ حالت میں بھی کتاب بچوں کے لیے بہت مفید ہے۔ اس کا ظاہری حسن بھی قابل تعریف ہے سرورق دیدہ زیب، کتابت و طباعت اچھی ہے۔ اور چار صفحات کی رنگین تصاویر

نے اس کی خوش نمائی میں اضافہ کیا ہے۔ (نظر زیدی)

تنویر اقبال | ڈاکٹر عبدالمغنی پروفیسر انگریزی و مدیر ماہنامہ مریخ پٹنہ۔ ناشر: مکتبہ تعمیر انسانیت اردو بازار، لاہور۔ سفید کاغذ و رنگین سرورق کے ساتھ (اگرچہ ذرا سادہ ہونا چاہیے تھا) ۲۹۶ صفحوں کی کتاب کی قیمت ۴۲/- روپے۔

اقبال (شخصیت، فکر اور فن) اردو میں ایک ایسا موضوع ہے، جس کی مثال کسی ایسے چشمۂ رواں کی سی ہے جس کا ہر قطرہ ذرّے ذرّے سے گلستان و خیاباں اُگاتا ہے۔ اس چشمے سے چاروں طرف نور کی ندیاں رواں ہیں۔ ہر سال نئی تنقیدی اور تشریحی کتابوں کی ایک نئی تعداد سامنے آجاتی ہے۔ لیکن اقبال کے کلام و پیام کے متعلق ڈوب کے لکھنے والے ناقد و مبصر بہت کم ہیں۔

ڈاکٹر عبدالمغنی جو اس کتاب کے علاوہ ۱۶ کتابیں سامنے لا چکے ہیں۔ اور ۱۹۹۰ء میں ۳ زیرِ طبع تھیں، تجزیاتی تنقید کے میدان میں پُر زور تخلیقی اسلوبِ اظہار کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں۔ ان کی تحریر ایسی عمدہ ہے کہ اس میں کہا جا سکتا ہے کہ "اور پھر بیاں اپنا"۔ ان کا کمال اقبال کے متعلق اپنے دعاوی کے تحت تجزیہ کاری سے اور معترضین اور نافہموں کے لیے دوٹوک وضاحتیں کرتے سے علی الخصوص ظاہر ہوتا ہے۔ اسی طرح نظم و نثر کے دوسرے بہت سے فن کاروں کو انہوں نے اپنے قلم کے ترازو پر تولا ہے۔ اور تنقید و توضیح کے ترازو کا صحیح استعمال کرنا سکھایا ہے۔ وہ مبہم، پُراسرار، انگریزی اصطلاحات سے بوجھل، فلسفیانہ عیارانہ انگیزی اور مرعوب کُن اندازِ بیان اختیار نہیں کرتے بلکہ شہرِ تنقید کے مروجہ فیشن کی زنجیروں سے آزاد ہو کر پُرزور بات کہتے ہیں۔ "اقبال کی حقیقت و عظمت"، "اقبال اور اسلامی فکر کی تشکیلِ جدید"، "کلامِ اقبال کی اشاریت (خاص اہمیت)"، "اقبال اور دہریت"، "موازنۂ اقبال و غالب"، "اقبال اور کارل مارکس"، جیسے مقالات پڑھ کر آپ اقبال شناسی کی بھی نئی منزلیں طے کر جائیں گے اور آپ کو یہ بھی اندازہ ہو جائے گا کہ عبدالمغنی سوچنے اور تجزیہ کرنے میں کتنا تدبر اور قدرتِ بیان

میں کیسا جادوگر ہے ۔ اس کی بڑی قوت یہ ہے کہ وہ بات کو سمجھ کر اور تول کر مکمل یقین کے سامنے پیش کرتا ہے ۔

ڈاکٹر پروفیسر عبدالمغنی اسلامیت کے بارے میں چونکہ کسی احساسِ کمتری ، بلکہ الحاد زدہ دنیا کے لحاظ سے "احساسِ جرم" میں مبتلا نہیں ہیں ۔ اس لیے اس کی آفاقیت کو اپنی جگہ برقرار رکھتے ہوئے اس کی اسلامیت کی پوری جھلک دکھا دیتے ہیں ۔ اس بارے میں صرف ایک اقتباس نقل کرتا ہوں :

"الحاصل، اقبال کی انسان دوستی چند مبہم خواہشات اور آوارہ جذبات کا مظاہرہ نہیں ، (ذرا اس جملے کو پھر غور سے پڑھیے ! ۔ س ۔ ص) یہ ایک واضح مقصد اور اصول کا اظہار ہے ۔ اس کا تعلق زندگی کے ایک نصب العین سے ہے ۔ یقیناً اس کا محرک اور فطری اور بے اختیار دردِ دل ہی ہوگا ، مگر اس کا مقصود عالمِ انسانیت کی منظم اصلاح ہے ۔" (ص ۱۵۲)

پون صفحے کی یہ عبارتِ مسلسل میں پوری نقل نہیں کرسکتا ۔ اور اس سے واضح ترکئی اور عبارتیں آپ خود ہی کتاب میں پڑھیے ۔ افسوس ہے کہ نہ میرا سرمایۂ اوقات و قویٰ زیادہ ساتھ دیتا ہے اور نہ ترجمان القرآن کی تنگ دامانیاں قلم کے لیے سازگار ہیں ۔

اشاریت والے مضمون میں جو مثالیں دی گئی ہیں ، کاش کہ ان میں سے ایک (طلوعِ اسلام کے ایک بند کا تجزیہ) میں نقل کرسکتا ۔ کیا شاندار تبصرہ ہے جو فہم اقبال کا کامیاب ذریعہ بن گیا ۔ اس "شعر نافہم" دور میں ایسی تحریروں کو پڑھ کر مجھے شعر العجم اور شعرالہند (شبلی) کی یاد آتی ہے ۔ مگر وہاں فاضل مؤلف دریائے سخن کے کنارے پر سے اس کے گردابوں ، حبابوں کا تماشا کراتا ہے اور یہاں کا نیا نکتہ شناس اپنے قارئین کو ساتھ لے کر سمندر میں کود جاتا ہے اور ہر چیز کو قریب سے دکھاتا اور حدِ فکر اور حدِ نظر کے علاوہ حدِ لمس میں بھی لاتا ہے ۔

آخر میں مکتبۂ تعمیرِ انسانیت کے لیے دلی تحسین !

پاک امریکہ تعلقات | از ڈاکٹر سید اسعد گیلانی، پی، ایچ، ڈی (سیاسیات)

ناشر: محمد عثمان شمسی، یمین اسلامک پبلشرز، لاہور - بہ اہتمام ادارۂ علم و ادب پاکستان۔

ان دنوں "پاکستان امریکہ تعلقات" خاصا اہم موضوع ہیں، اور دانشور اور اخبارات اور سیاسی و مذہبی اکابر، تحریر و تقریر کے ذریعے اپنے خیالات لا رہے ہیں۔ اسعد گیلانی نے خوب کام کیا کہ مختلف اہلِ قلم کی ۳۶ تحریریں یک جا کر دیں، جنہیں پڑھ کر پاک امریکہ تعلقات کے ماضی کے تجربات بھی سامنے آجاتے ہیں۔ اور مستقبل کے لیے اکابر و عوام کے خطوطِ فکر بھی ــــ ۲۰۰ کے قریب صفحات، رنگین دبیز کور، قیمت درج نہیں۔

فصلِ زیاں | مجموعۂ غزلیات حفیظ الرحمٰن احسن مینیجنگ ایڈیٹر سیارہ۔

ناشر: سدا بہار پبلشرز - ۱۷ - اردو بازار، لاہور- صفحات: ۱۳۶ - سفید کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، سرورق آرٹ کارڈ، آرٹ ورک کے ساتھ۔

قیمت ۴۵/- روپے۔

حسّاس فن کاروں کے لیے جب ناسازگار دور آتے ہیں، دماغ جلنے لگتے ہیں، گلے گھٹ جاتے ہیں، امیدوں کے چراغوں کی لو مدہم ہو جاتی ہے، تیرگی میں مجسمہ ہائے تخریبِ اقدار تیرہ تلوار لے کر ہر طرف پھیل جاتے ہیں تو ایسی مایوسی گھٹن میں اصنافِ سخن کے نئے پیرائے نمودار ہو جاتے ہیں۔ گذشتہ دورِ بے ضمیری کو فصلِ غزل کے بجائے فصلِ زیاں کہہ کر نہ صرف اپج سے کام لیا گیا ہے، بلکہ محسوس کرایا گیا ہے کہ سیاسی، اخلاقی، مالی اور بین الاقوامی لحاظ سے ہم نے زیاں کاری کا دور گزارا ہے۔

ایسی فضا میں غزل حقیقت اور اشاریت کے درمیان کئی مقامات پسند کر سکتی ہے جن میں سے ایک وہ ہے جسے حفیظ احسن صاحب نے برتا ہے اور اس کے متعلق

مشہور ادیب اشفاق احمد نے خوب لکھا ہے کہ:

"مولانا ظفر علی خاں کے کمالِ فن اور اکبر الٰہ آبادی کی کاٹ کے دو عظیم دھاروں کے مابین ایک اور آبنائے شعر، جو اپنے وجود میں مختصر مگر اپنی تندی میں کڑی کمان کا وہ تیر ہے جو فصیلِ زیاں کے ترکش ہی سے برآمد ہو سکتا ہے۔" (فلیپ)

اب میں اور کیا کہوں ـــ جب کہ میں نے اس کتاب کی تقریظ کے خاتمے پر لکھا ہے کہ "ہمارے نوجوان شاعر حفیظ الرحمٰن احسن کا مجموعہ بتاتا ہے کہ اگر ان کے بعض کھلے کھلے سیاسی اشعار کو ایک اور طرح کا سامانِ دلچسپی قرار دے لیا جائے تو ان کے مجموعۂ غزل میں غزل کا لہجہ گھٹا بن کر چھایا ہوا ہے"۔ آخر میں ایک شعر ؎

کس کو سمجھائیں کہ ہے تعمیر کیا، تخریب کیا
وائے حسرت امتیازِ خیر و شر کوئی نہیں

اہل بیت حصہ اوّل مصنف: فائد المعروسی۔ ترجمہ از عربی: مولانا محمد سعید الرحمٰن علوی

ناشر: چوہدری ثناء اللہ مٹھڑ۔ بساطِ ادب، چوک انارکلی، ادبی مارکیٹ، لاہور ۲۔ ٹائیٹل آرٹ کارڈ، ڈیزائن سے آراستہ۔ صفحات: ۲۴۵۔ قیمت: ۱۵۵/ روپے پیپر بیک سرورق ۹۵/ روپے۔

فائد المعروسی کا کام بھی بڑا اہم ہے، مگر مولانا محمد سعید الرحمٰن علوی بھی بڑے زوردار ادیب و خطیب ہیں۔ ایک لحاظ سے یہ کتاب علمی نوعیت رکھتی ہے، دوسری طرف پیرایۂ بیان کہانیوں جیسا دلچسپ ہے۔

میں ان مندرجات پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں محسوس کر رہا جو مصنف و مترجم نے پیش کر کے حقائق کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ علمی اختلاف کہ مباہلہ کے لیے چادر میں لیے گئے نفوس ہی اہل بیت تھے یا ازواجِ مطہرات بھی اہل بیت میں شامل تھیں، یا حضورؐ کے تمام قریبی لواحقین بھی اس دائرے میں آتے ہیں ـــ

اس کی نوعیت اپنی جگہ اہم، مگر اصل قضیہ یہ ہے کہ "اہلِ بیت" کی اصطلاح اور اس کا اطلاق شیعہ نقطۂ نظر سے ایک خاص شکل رکھتا ہے، اس کی باقاعدہ شرعی و فقہی حیثیت ہے۔ اور پھر اہلِ بیت کی اولاد بطور سیّد مستقلاً خاص حقوق رکھتی ہے۔ مشکل یہ ہوئی جب کوئی مسئلہ فرقہ وارانہ خراد پہ چڑھ جاتا ہے تو پھر نہ لغت کام کرتی ہے، نہ عُرف، نہ نصوص، نہ حدیث و سیر کی روایات۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اہل بیت کی مخصوص نوعیت سبائی منصوبہ کے تحت نمودار ہوئی۔ اور اس نے ایسے تحریفی و تخریبی فتنے پیدا کر دیئے کہ پرچم توحید کو لے کر کھڑی ہونے والی صاحب اتحاد و اخوت ملت ہمیشہ کے لیے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔

آپ جو بھی مفید ایمان و عمل بحثیں ہوں، ضرور لائیے۔ مگر یہ بتایئے کہ اس دراڑ کا کیا علاج ہے۔ جو حصارِ ملت میں ہمیشہ کے لیے پڑ گئی۔ تاہم جو مواد اس ترجمہ شدہ کتاب میں پیش کیا گیا ہے وہ اہلِ انصاف و اعتدال کے لیے مفید رہے گا۔

اسلام میں خدمتِ خلق کا تصور از قلم مولانا سیّد جلال الدین عمری۔ ناشر: ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی، علی گڑھ (انڈیا) کتابت و طباعت بہت خوب، ٹائیٹل دبیز رنگین۔ صفحات: ۱۷۵۔ قیمت: ۲۵/- روپے

سیّد جلال الدین عمری صاحب کے نام سے خادمِ اسلام حلقوں میں کون واقف نہ ہو گا۔ عرصہ سے ان کا قلم دینی علم اور تعلیم کے میدان میں محوسفر ہے۔ ان کی تازہ کتاب سامنے ہے۔ دراصل دین دو بڑی چیزوں پر مشتمل ہے، خدا سے بندگی و طاعت کا تعلق اور انسانوں سے اخوت و خدمت کا تعلق ـــ خدا سے تعلق بہترین قولی اور افکار اور جذبات سے قلب و ذہن کو آراستہ کرتا ہے۔ اور انسانوں سے صحیح تعلق خدا پرستانہ قلبی اور ذہنی قوتوں کو عملاً برتنے سے عبارت ہے۔ انسانوں کی محبت و خدمت آدمی کو تقشفِ بے جا سے روکتی ہے۔ کبرِ علم و تقویٰ کے خطرات سے بچا کر عاجزی و فروتنی کے مقام پر لاتی ہے، اور یہی مقام ہے جس پر رہ کر خدا کی دعوت

کو انسانوں تک زیادہ بہتر طریق سے پہنچایا جا سکتا ہے۔ مؤلف نے بجا طور پر انسانوں کی خدمت کو عبادت قرار دیا ہے۔ (جب کہ مطلوب اطاعتِ الٰہی اور حصولِ رضائے الٰہی ہو)۔

عمری صاحب کی کتاب میں خدمتِ خلق کے ہر پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔ خدمت کا مرتبہ، خدمت کے مستحقین، خدمت کے طریقے، بعض متعین پہلو، رفاہی خدمات، خدمتی ادارے اور تنظیمیں، حقوق کی فطری ترتیب اور اُن کی رُوح اخلاص جیسے موضوعات پر گفتگو کرتے ہوئے مولانا سیّد جلال الدین عمری صاحب نے قرآنِ پاک کی آیات، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث، صحابہ و دیگر اکابرین کے مقولات یا معمولات کے ذکر سے دلائل اور مثالیں اخذ کی ہیں۔

ایک نظر انداز شدہ اہم موضوع پر مصنف نے کتاب لکھ کر بڑی نیکی کی ہے۔ خدا نوجوان قوتوں کو اس مہم کو اور آگے بڑھا لے جانے کی ہمت دے۔

اقلیتوں کے تعلیمی حقوق اور مسائل | تصنیف: پروفیسر اکبر رحمانی۔ ناشر: ایجوکیشنل اکادمی اسلام پورہ۔ جلگاؤں ۰۰۱ ۴۲۵ (بھارت)۔ صفحات ۱۷۶۔ قیمت: ۴۰ روپے

اکبر رحمانی صاحب مدیر ماہنامہ "آموزگار" نے بھارت میں تعلیم و تدریس کے سلسلے میں بڑی گراں قدر خدمات سرانجام دی ہیں۔ اسی سلسلے میں یہ کتاب بھارتی سماج کے تناظر میں اقلیتوں کے تعلیمی حقوق سے متعلق ہے۔ اس میں وہاں کے دستور و قانون میں اقلیتوں کو جو حقوق حاصل ہیں۔ ان کا تذکرہ ہے اور جو سرکاری تعلیمی پالیسیاں وقتاً فوقتاً وہاں نافذ ہوتی رہی ہیں ان کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ بھارت میں اقلیتوں کو جن تعلیمی مسائل سے سابقہ درپیش ہے، ان کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔ بالخصوص مسلم اقلیت کے تعلیمی اُمور و مسائل پر اور اُردو زبان کے تحفظ کے بارے میں مفصل بحث درج ہے اور اس سلسلے میں مفید اور قابلِ عمل تجاویز و مشورے بھی دیئے گئے ہیں۔ اپنے موضوع پر نہایت مفید، اہم اور معلوماتی کتاب ہے۔

BANNED PUBLICATIONS OF PAKISTAN | مرتبہ: ممتاز الاسلام

ناشر: بیورو آف ببلوگرافی اینڈ ریفرنس کراچی ۔ صفحات: ۱۷ قیمت درج نہیں۔
اس کتابچے میں ان کتابوں کی فہرست دی گئی ہے۔ جنہیں پاکستان کی صوبائی حکومتوں نے پریس اینڈ پبلی کیشنز آرڈی ننس مجریہ ۱۹۶۳ء کے تحت ۱۹۸۱ء تا ۱۹۸۶ء کے چھ برسوں کے دوران میں ضبط کیا ہے۔ اس میں ۴۳ کتابچوں ۲ ہینڈبلوں، دو ورقوں اور ۵۴ مختلف جرائد کے بہت سے شماروں کی تفصیل درج ہے جنہیں ضبط کیا گیا تھا اور یہ معلوماتی کتابچہ پاکستانی اخبارات کی مدد سے مرتب کیا گیا ہے۔ یہ ایک نئی طرز کی بہت اچھی کوشش ہے۔

ماہنامہ "افکار ملی" | ایڈیٹر: ڈاکٹر سید قاسم رسول الیاس ۔ پتہ دفتر ۱۵۳/۲۲ ای ذاکر نگر، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵ ۔

دہلی (بھارت) سے شائع ہونے والا یہ ماہنامہ ایک مکمل جریدہ ہے جس میں ہر قسم کی ملکی اور غیر ملکی خبریں، تبصرے، تجزیے اور معلوماتی مضامین شامل ہیں۔ ہمارے سامنے دسمبر ۱۹۹۰ء کا شمارہ ہے۔ جو ہر شعبۂ زندگی سے متعلق جامع تحریروں پر مشتمل ہے۔ زر تعاون فی شمارہ ۷/- روپے اور سالانہ ۷۰/- روپے ہے۔

سخت شرمندگی کے ساتھ

ترجمان القرآن میں طباعتی اغلاط کی کثرت نے میرا سر جھکا دیا ہے۔ ہر دفعہ پرچہ دیکھ کر بڑی شرمندگی ہوتی ہے۔ افسوس کہ مجھے کوئی معاون کام میں ایسا نہ مل سکا جو میرا بوجھ کم کراتا۔ تاہم اب میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ کوئی دن گر زندگانی اور ہے اور "قلم کی روانی" بھی اور ہے — تو پھر تصحیح کے لیے میں اس مرتبہ کچھ خصوصی انتظام کرا رہا ہوں۔

تاہم شرمندگی کے ساتھ اس مرتبہ کی تصحیحات پیش کر رہا ہوں جو شاید تمام اغلاط پر حاوی نہیں ہیں۔

ص	۹	سطر	۹	ایک "کہ" زائد ہے۔
"	۱۱	"	۷	"مقریزی" کے بجائے "مقریزیؒ"۔
"	۱۱	"	۹	"اس نے" دو مرتبہ ہے۔ ایک مرتبہ چاہیے۔
"	۱۲	"	۲	"عند الدولہ" کے بجائے "عضد الدولہ"۔
"	۱۲	"	۸	"روزہ روٹی" کے بجائے "روزانہ روٹی"
"	۱۲	"	۱۵	"لیدہ" کو حذف کر دیں۔
"	"	"	"	سطر کے آخر میں "سے" حذف کر دیں۔
"	"	"	۲۰	صحیح عبارت: "جو طرح ڈالی اور عملی اصول مقرر کیے"۔
ص	۳۱	- عربی عبارت کی سطر	۲	"ھذا الحق" کے بجائے حَذَا الْحَقِّ
"	"	"	۷	جَعَلَكُمْ کے بجائے "يَجْمَعُكُمْ"
"	"	"	آخری سطر	تُمَّ کے بجائے ثُمَّ
ص	۵۶	سطر	۸	"چھپایا" کے بجائے "چھاپا"

(ادارہ)

REGD. NO. L 5340

PHONE : 324468

MONTHLY **TARJUMAN-UL-QURAN** LAHORE

جاری کردہ: مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ماہنامہ ترجمان القرآن

رودادِ اجتماعِ عام

- افتتاحی خطاب
- کلیدی خطاب
- خطاب جلسۂ عام
- اختتامی خطاب

قاضی حسین احمد امیر جماعتِ اسلامی

- رپورٹ جماعتِ اسلامی پاکستان، ۸۳-۸۹ء
  (قافلۂ حق کی چھ سالہ رودادِ سفر)
- اعلامیہ

اجتماعِ عام نمبر ۸۹ء

دیگر تقاریر

- دروسِ قرآن و حدیث
- انقلابی کردار: ایمان، جہاد اور دعوت
- انقلابی جماعت: رُحَمَاءُ بَيْنَهُم
- پاکستان میں جماعتِ اسلامی کا کردار
- اسلامی انقلاب میں خواتین کا کردار
- نوجوان ــــ اسلامی انقلاب کا ہراول دستہ
- ہم اس ملک میں کیا معاشی تبدیلیاں لائیں گے؟
- بین الاقوامی مندوبین

مقررین

میاں طفیل محمد	مولانا جان محمد عباسی	پروفیسر غفور احمد
چودھری رحمت الٰہی	پروفیسر خورشید احمد	خرم مراد
نعیم صدیقی	مولانا خلیل احمد حامدی	مولانا گوہر رحمٰن
مولانا فتح محمد	حافظ محمد ادریس	لیاقت بلوچ
سید منور حسن	ایوب ٹھاکر	ڈاکٹر صیام

- ٹائیٹل، دیدہ زیب
- کتابت، کمپیوٹرائزڈ
- ضخامت، ۲۶۴ صفحات
- قیمت، -/۳۰ روپے
- لائبریری ایڈیشن، -/۴۵ روپے

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ اردو بازار، لاہور

فون: ۳۲۴۴۶۸-۶۸۶۳۶ : پوسٹ بکس ۱۴۴۳